تابش دہلوی

دیدبانیے

ہمارے دور میں اُردو کے منفرد شاعر تابش دہلوی صاحب کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب "دید باز دید" بلا شک و شبہ ہم عصری سوانحی ادب کا شاہکار ہے مصنف نے اپنے قابلِ فخر اسلاف کے مولد دہلی کے گردِ اکابر ادب کی یادوں میں بسی ایک ایسی حیران کن اور پُر تاثیر دستاویز پیش کی ہے جس میں اس کے بچپن اور جوانی کے دہلی اور حیدر آباد (دکن) کے اور گذشتہ نصف صدی کے پاکستان کے حوالے سے اہم تاثرات بہم ہو جاتے ہیں۔ ایک اہم شاعر و ادیب کی یادوں نے ہمیں بعض شخصیات کی زندگی کے اہم نجی پہلوؤں تک رسائی کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ایک بات جو بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ مصنف کی "دید باز دید" کا نثری اسلوب اس قدر دلکش اور موثر ہے کہ اس کتاب کے قارئین مصنف کے تجربات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرتے چلے جاتے ہیں

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

برائے تبصرہ قومی زبان

انجمن ترقی اردو
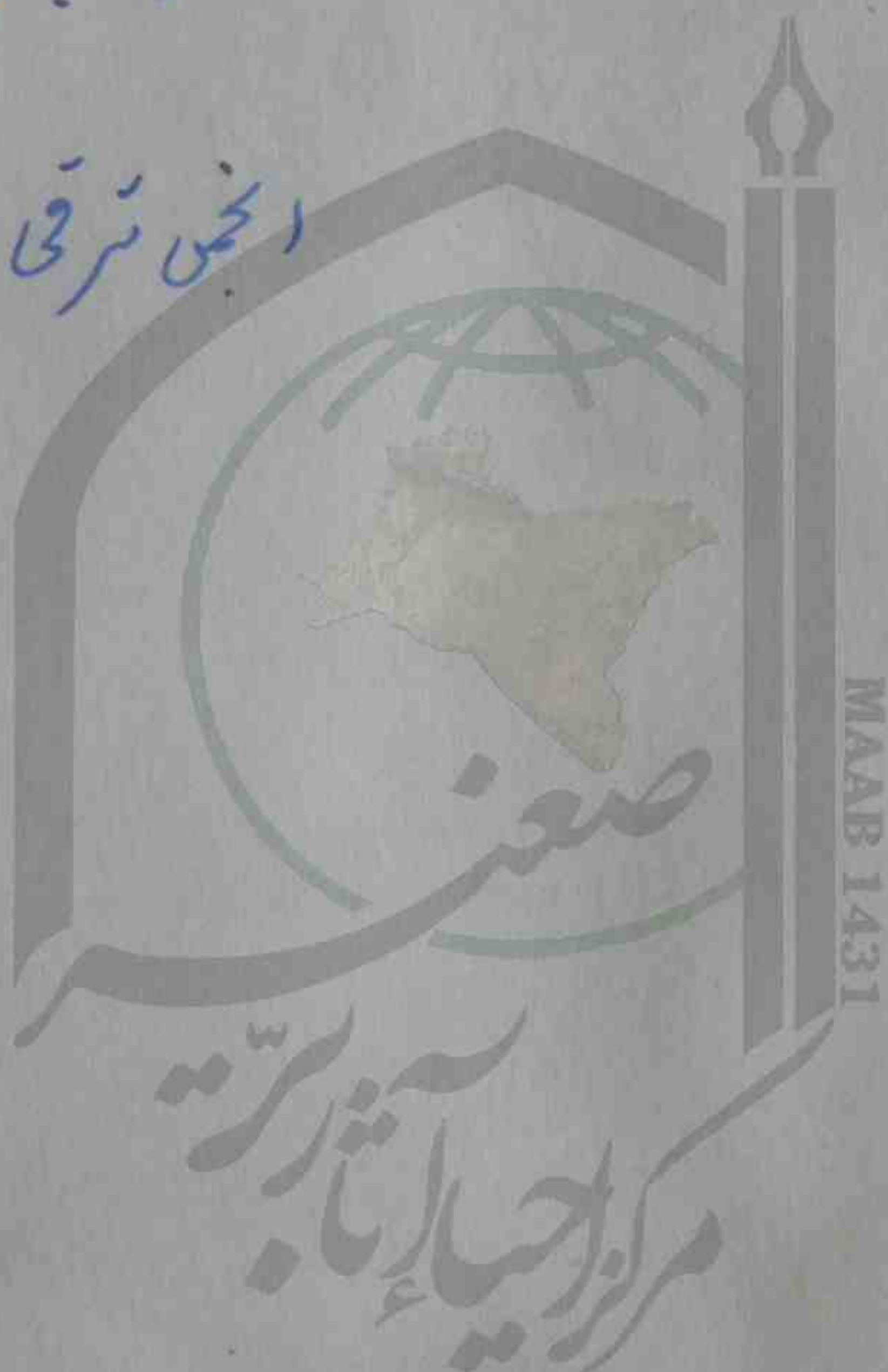
دید، باز دید

کتاب ملنے کا پتہ

ادب گاہ
بلاک ۳ - ۱۰۳ اے ۹/۶ ناظم آباد کراچی ۱۸ فون: ۶۱۹۸۲۵

دید، بازدید

تابش دہلوی

نام کتاب : دید باز دید
مصنف : تابش دہلوی
تاریخ اشاعت : ۱۹۹۰ء طبع اوّل
تعداد : ایک ہزار ایک سو
ناشر طبع اوّل : حیات اکاڈمی کراچی
طبع دوئم : ۱۹۹۷ء
تعداد : ایک ہزار ایک سو
اہتمام : نعیم میرٹھی
پیشکش طبع دوئم : کُل پاکستان حلقہ ادب
۲۱-سی، شیلوزون سینٹر یونیورسٹی روڈ
گلشن اقبال۔ کراچی، فون :۔ ۴۹۷۲۴۱۳
طابع دوئم :: افریشیا پرنٹنگ پریس ناظم آباد ۲ کراچی

قیمت ۱۲۵ روپے

انتساب

مشفق خواجہ کے نام

تابش دہلوی

کیوں یاد نہ آجائیں وہ بھولی ہوئی باتیں
کچھ بھولنے والوں نے مجھے یاد کیا ہے

تابش دہلوی

تہذیب

صہبا لکھنوی مدیر افکار کراچی

انکشافِ ذات

پیدائش: ۹ نومبر ۱۹۱۱ء بمقام: دہلی

خاندانی نام سید مسعود الحسن۔ علم و ادب کی فضا گھرانے سے نصیب ہوئی
ددھیال میں فارسی کے شاعر مولوی نظام الدین نظامیؔ، ننھیال میں شمس العلماء
منشی ذکاء اللہ اور رفیقۂ حیات محمودہ بیگم جو نواب طالع یار خان کی پوتی ہیں۔ تابش صاحب
کی غالب سے کوئی نسبت نہیں۔ غالب ان کی بیوی کے رشتے کے خالو تھے۔

بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد دکن کے پوسٹ آفیسز میں پہلی
ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۴۰ء میں دلی آ گئے اور آل انڈیا ریڈیو میں بحیثیت اناؤنسر، نیوز ریڈر
ملازم ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے اور ۱۹۶۳ء تک بطور نیوز ریڈر فرائض انجام
دیئے۔ ۱۹۶۳ء میں اسکول براڈ کاسٹ کے شعبے سے منسلک ہوئے اور ۱۹۸۰ء میں سینیئر
پروڈیوسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

ادبی سفر کی ابتداء ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ پہلا تخلص مسعود تھا۔ بعد میں تابش اختیار کیا

پہلا شعر یہ ہے۔

کہاں کہاں مجھے مسعود لوگ ڈھونڈ آئے
بھلا میں اس کی گلی کے سوا کہاں جاتا

آپ کی پہلی مطبوعہ نظم بعنوان "دلی" ماہنامہ ساقی۔ دہلی کے شمارہ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں فانی بدایونی سے حیدرآباد دکن میں شرفِ تلمذ حاصل کیا جن شعراء کے آپ نے اثرات قبول کئے۔ اُن میں مظہر جان جاناں، میر تقی میر، خواجہ میر درد، غالب، مومن اور فانی بدایونی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

آپ کا پہلا نثری مضمون بعنوان "یادِ ایامِ صحبتِ فانی" ماہنامہ برہان۔ دہلی کے شمارہ اگست ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ فانی کے علاوہ آپ کے متعدد مضامین اور خاکے سید ذوالفقار علی بخاری، یاس یگانہ، ماہر القادری، محشر بدایونی، میراجی، صابر دہلوی اور جوش ملیح آبادی پر ممتاز ادبی رسائل مثلاً آجکل دہلی، ماہِ نو، سیپ، غالب، فاران، علی گڈھ میگزین اور افکار وغیرہ میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

تابش دہلوی اردو نظم و غزل کی کلاسیکی روایت کے علمبردار ہیں اور اُن کی ادبی خدمات نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہیں۔ اب تک آپ کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں

- پہلا شعری مجموعہ: نیم روز ۱۹۶۳ء
- دوسرا شعری مجموعہ: چراغِ صحرا: ۱۹۸۳ء
- غبارِ انجم: ۱۹۸۴ء
- تقدیس ۱۹۸۴ء
- مجموعہ غزلیات: ماہِ شکستہ ۱۹۹۳ء
- دید باز دید ۱۹۹۰ء
- دھوپ چھاؤں ۱۹۹۶ء

مُبتدا

میں ۱۹۴۰ء میں حیدر آباد دکن سے مستقل طور پر دلی آ گیا، یہ زمانہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا، دلی میں امریکی اور انگریز فوجیوں کی بھرمار تھی بلکہ یوں کہیئے کہ دلی بھی ایک بڑی فوجی چھاؤنی تھی۔ عالمی سیاسی حالات دگرگوں تھے، ان حالات میں ذہنی سکون کا حصول نہایت ضروری تھا، چنانچہ ایک ادبی حلقہ وجود میں آیا، اس حلقہ میں بزرگ اور جوان سبھی شامل تھے۔ بزرگوں میں مولانا ایوب دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا عتیق الرحمٰن، مولانا سعید اکبر آبادی اور مشتاق احمد زاہدی (سابق پرنسپل بہادلپور کالج) جیسی مقتدر ہستیاں تھیں اور جوانوں میں نہال سیوہاروی، زیبا ردولوی، سیّد محمد جعفری، شعیب حزیں، ہدایت محسنی، نظر امروہوی، ہوش امروہوی، مجتبٰی الدین شارق، ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی اور وامق جونپوری (جو اس زمانہ میں دلی میں تھے) شامل تھے، ان میں سے بعض اب ہم میں نہیں ہیں اللہ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے!! اس حلقہ کا کوئی نام نہیں تھا اور نہ اس کی نشستیں باقاعدہ ہوتیں کبھی پندھرواڑے کبھی ماہانہ باری باری سے احباب کے یہاں سب جمع ہو جاتے اور سیاست، مذہب، ادب غرض ہر موضوع پر گفتگو ہوتی اور فواکہات اور چائے پر ان محفلوں کا اختتام ہوتا۔ ان محفلوں میں تازہ کلام اور تازہ مضامین بھی پڑھے جاتے جس پر تعمیری تنقید ہوتی۔

۱۹۴۱ء میں حضرت فانیؔ بدایونی کا انتقال ہوا، میں نے اپنی زندگی کی پہلی نثر "یادِ ایامِ صحبتِ فانیؒ" کے عنوان سے لکھی اور اسی طرح کی ایک محفل میں پڑھی، مولانا سعید اکبر آبادی کو جو ماہنامہ برہان دہلی کے مدیر تھے یہ مضمون پسند آیا

انہوں نے مجھ سے یہ مضمون لے کر ادارتی نوٹ کے ساتھ برہان دہلی میں شائع کیا، یہ مضمون عام طور پر بھی خاصا پسند کیا گیا، یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔

یہ مضمون میرا پہلا مضمون تھا اس سے ایک ادبی خوشی یہ میسر آئی کہ مشہور طنز و مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک خط میں اس مضمون پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں علی گڑھ میگزین (علیگڑھ یونیورسٹی کا مجلّہ) کے فانیؔ نمبر کے لئے ایک مضمون لکھ دوں چنانچہ میں نے ایک مضمون "فانیؔ کی شاعری میں اُن کی زندگی" لکھا جو علی گڑھ میگزین کے فانیؔ نمبر میں شامل ہے اور اس طرح میری مضمون نگاری کا آغاز ہوا۔

ہندوستان میں حضرت فانیؔ پر پروفیسر مُغنی تبسّم نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور اُن کے اس THESIS میں جو کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے، میرے رسالہ بُرھان دہلی اور رسالہ آجکل دہلی کے مضامین کے حوالے شامل ہیں جو میرے لئے عزّت کی بات ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی فانیؔ پر کام کر رہے ہیں انہوں نے بھی — میرے اِن مضامین کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ رکھّا ہے۔

اس کتاب میں بعض شخصیتوں کے قلمی چہرے، تنقیدی مضامین، اور چند تبصرے شامل ہیں، بعض مضامین میں سیاق و سباق کے اختلاف کے باوجود بعض واقعات، بعض نام اور بعض اشعار کی تکرار ہوئی ہے جو ناگزیر تھی۔ ان مضامین میں بعض ایسے مشاہیر کا تذکرہ ہے جنھیں پرانے لوگ بھول چکے ہیں اور جنہیں نئی نسل تو جانتی ہی نہیں حالانکہ اِن بزرگوں کے نام تہذیب و ثقافت ہمیشہ ادب سے لیں گے، نئی نسل کی یہ لاعلمی اور پرانے لوگوں کی یہ "بزرگ فراموشی" ہمارے تہذیبی ارتقاء کے لئے نہایت افسوسناک ہے، ہمیں اپنے ماضی کی تمام عظیم شخصیتوں کو یاد رکھنا چاہیئے کیونکہ یہ شخصیتیں اور ان کے کارنامے ہماری تاریخ کا ضروری حصّہ ہیں اور وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو روشن مستقبل کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنے تاریخی ورثہ کو یاد رکھتی ہیں اور اس طرح اپنے قومی تشخص کو مسخ ہونے سے بچا لیتی ہیں۔

میں نے اپنے نثری مضامین کبھی جمع نہیں کئے۔ نہ معلوم کیوں؟ برادرم مشفق خواجہ نے مجھے اس طرف متوجہ کیا اور یہ کتاب دراصل انہی کی تحریک پر اشاعت پذیر ہو سکی ہے، مجھے ان مضامین کے بارے میں کوئی حسنِ ظن نہیں ہے، میں نے یہ مضامین کتابی صورت میں پیش کر کے ان واقعات کو جو میرے ذہن میں محفوظ تھے محفوظ تر کرنے کی کوشش کی ہے اُمید ہے یہ کوشش نا مطبوع نہ ہو گی۔

میرا لڑکپن حیدر آباد (دکن) میں گزرا ہے میں نے ہندوستان کے قدیم ترین اسکول دارالعلوم چارکماں میں تعلیم پائی ہے اور وہاں کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کی اعلےٰ قدروں سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ لڑکپن کے یہ تہذیبی نقوش میرے ذہن و دل پر آج بھی مرتسم ہیں۔

میری والدہ کے ماموں مولوی عنایت اللہ صاحب جو شمس العلماء منشی ذکاءاللہ صاحب کے فرزند تھے حیدر آباد ریاست میں ناظم دارالترجمہ تھے۔ ان کے ساتھ پندرہ برس میں بھی حیدر آباد میں رہا۔ ذہنی تربیت تمام تر حیدر آبادہی میں ہوئی۔ اُس زمانے میں حیدر آباد علم و ادب کا گہوارہ تھا، وہاں جن لوگوں سے ملنے کا اور نیاز رکھنے کا موقع ملا اُن میں مہاراجہ بہادر کشن پرشاد شاد۔ نواب تراب یار جنگ سعید، مہاراجہ پرتاب گیر، مرزا ہادی رسوا، نظم طباطبائی، فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، مولانا عبد القدیر بدایونی، مولوی عبد الحق (بابائے اردو)، مولانا عبد اللہ عمادی، عظمت اللہ خاں، وحید الدین سلیم، عبد القادر سروری، محی الدین قادری زور، مولانا شمس اللہ قادری، امجد حیدر آبادی، حیرت بدایونی، آغا حیدر حسن، سید وزیر حسن، غلام یزدانی، نثار یار جنگ، ڈاکٹر اشرف الحق، حکیم آزاد انصاری، آل عبا آوارہ، مرزا فرحت اللہ بیگ، سید ہاشمی فرید آبادی، تسنیم مینائی، ماہر القادری، حسرت ترمذی، سکندر علی وجد، مخدوم محی الدین، قاضی عبد الغفار، عبد اللہ خویشگی، شعیب حزیں اور صمد رضوی ساز قابلِ ذکر ہیں۔

دلّی میں جن بزرگوں اور دوستوں سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا اُن میں آغا شاعر قزلباش، بیخود دہلوی، سائل دہلوی، تربھون ناتھ زار، مولانا محمد ایوب، ماسٹر شادی لال،

حیدر دہلوی، ماسٹر ہر یرام، جگر مراد آبادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت امرناتھ ساحر، کیفی دتاتریہ، مہاراج بہادر برق، خواجہ حسن نظامی، ناصر نذیر فراق، راشد الخیری، قاری سرفراز حسین، میر ناصر علی، مولوی احتشام الدین، ڈاکٹر عبدالجبار خیری، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر مرزا محمد سعید، شاہد احمد دہلوی، صادق الخیری، فضل حق قریشی، ظفر قریشی، انصار ناصری، ملا واحدی، ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، نہال سیوہاروی، نخشب جارچوی، اخلاق احمد، پروفیسر اے۔ ایس بخاری پطرس، چراغ حسن حسرت، ن۔م۔ راشد، میراجی، مختار صدیقی، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر، پروفیسر محمد حسن عسکری، حیات اللہ انصاری، سید محمد جعفری، زیبا ردولوی مجاز، ڈاکٹر تاثیر، زیڈ اے بخاری، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، رشید احمد صدیقی، فراق گورکھپوری، حامد علی خاں، حمید احمد خاں، وقار عظیم، عبادت بریلوی اور خلیل الرحمٰن کے نام مجھے خوب یاد ہیں اور مرتے دم تک یاد رہیں گے کیونکہ ان بزرگوں اور دوستوں کی صحبتوں میں جو وقت گزرا وہ زندگی کا عظیم سرمایہ ہے۔ ذہن میں اور بھی بہت سے نام محفوظ ہیں اور میں یہ فہرست مرتب کرکے درصل ان جان سے زیادہ عزیز یادوں کو محفوظ کرنا چاہتا ہوں تاکہ آنے والی نسلیں جب کوئی ثقافتی تاریخ مرتب کریں تو یہ نام اُن کی فہرست سے نہ رہ جائیں۔

پاکستان بننے کے بعد جن بزرگوں اور دوستوں سے رابطہ رہا وہ یہ ہیں: سر عبدالقادر، غلام بھیک نیرنگ، جسٹس ایس اے رحمٰن، آرزو لکھنوی، عابد علی عابد، احمد ندیم قاسمی، قیوم نظر، یوسف ظفر، پیر حسام الدین راشدی، بابا ذہین شاہ تاجی، ارم لکھنوی، ڈاکٹر احسن فاروقی، سید مجتبےٰ حسین، خان بہادر حبیب الرحمٰن، اے۔ ڈی۔ اظہر، پروفیسر سلیم قریشی، علاء الدین خالد، مرزا اسلم بیگ، مہدی علی صدیقی، پروفیسر ایم۔ایم۔ احمد، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، صبا اکبر آبادی، ابوالخیر کشفی اور ڈاکٹر یاور عباس قابلِ ذکر ہیں۔

ناموں کی یہ فہرست طویل ہے مگر یہ نام میری زندگی پر گہرا اثر رکھتے ہیں اور ان لوگوں نے میری ذہنی اور تہذیبی تربیت میں بڑا حصّہ لیا ہے اس لئے انھیں یاد رکھنا میرے لئے ضروری ہے۔

میں جناب سفیر رضا نقوی صدر حیات اکادمی کراچی کا نہایت ممنون ہوں جن کی امداد کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ناممکن تھی۔

تابش دہلوی

یادِ ایامِ صحبتِ فانی

جناب تابش دہلوی اردو کے خوش فکر نوجوان شاعر ہیں۔ برسوں تک جناب فانی بدایونی کے ساتھ رہے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنی اور فانی مرحوم کی چند صحبتوں کا ذکر کیا ہے جو آئندہ ان کے سوانح نگار کے لئے کارآمد ہوگا۔

(برہان)

دہلی سے پہلے پہل حیدر آباد (دکن) جاتے ہوئے ایک ہم سفر دوست نے فانی بدایونی مرحوم کی "باقیات" پڑھنے کے لیے دی، باوجود کوشش کے کچھ پلّے نہ پڑا، دماغ تو "کس نے بوسے تیرے گن گن کے لئے" پر دل کی طرح دھڑکنے کا عادی تھا اور ذہن میں "غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری" کے رشک کے علاوہ ہر احساس ناپید تھا اور فکر اس بار سے دبی پڑی تھی کہ "بوجھ اٹھواتے ہیں اب ناز اٹھانے والے"، بھلا اِس حال میں "ٹوٹا طلسمِ ہستیِ فانی کے راز کا احسان مند ہوں الم جانگداز گا" جیسے اشعار دل و دماغ میں کیا پیوست ہوتے، غرض تمام حواس

"شعری کثافت" سے آلودہ تھے۔ "باقیات" ایک ہی دفعہ میں کیا جلا کرتی!! میں نے تنگ آکر واپس کر دی۔

حیدر آباد (دکن) میں جن عزیز کے یہاں مقیم ہوا ان کے پاس بھی "باقیات" دیکھی اور ان کو فانی کا مداح بھی پایا، انھوں نے مجھے پڑھنے کے لیے دی، میں نے رشید احمد صدیقی کے مقدمہ سے لے کر "عرضِ حال" تک پڑھ ڈالی، کچھ پلے نہ پڑا، پھر پڑھی، اب دماغ میں کہیں کہیں "باقیات" کے اشعار پیوست ہونے لگے، پھر پڑھی پھر پڑھی، یہاں تک کہ آدھی سے زیادہ ازبر ہوگئی اور دماغ کو بھی نصف سے زیادہ مجلّٰی کر گئی۔ غرض یہ تھا وہ غائبانہ نیاز جو فانی سے حاصل ہوا اور اب جو ایک مستقل یادگار بن کر دل کی زندگی ہو کر رہ گیا ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد صدر اعظم دولت آصفیہ ہندوستان کی اُن ذی مرتبت ہستیوں میں سے تھے جن پر ہندوستان ہمیشہ فخر کرے گا۔ ان کا قُرب گنگا اور زمزم کا سنگم معلوم ہوتا تھا۔ ان کی ذات ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب کا بہترین نمونہ تھی، مہاراجہ وہی آداب و مراتب ہر شخص کے ساتھ برتتے تھے جو خود ان کے شایانِ شان ہوتے تھے، وہ خود بھی عمدہ شاعر تھے، اربابِ ذوق اور اہلِ کمال کے ہجوم ان کے درباروں کی زینت تھے، فانی پر ان کی خاص چشم کرم تھی، مہاراجہ بہادر فانی اور کلامِ فانی کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، چنانچہ جب فانی کی وکالت آگرہ میں غیر معمولی ادبی شغف اور دوست

پرستی کی وجہ سے نہ چلی تو مہاراجہ ہی نے ان کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی۔

جامعہ عثمانیہ کے ایک اقامت خانہ (غالباً فرحت منزل عدنان باغ) میں جب جامعہ عارضی طور پر جونس کمپنی کے قرب وجوار کی عمارتوں میں تھی، فانی کے اعزاز میں مہاراجہ بہادر کی صدارت میں ایک بزم مشاعرہ ترتیب دی گئی جس میں حیدر آبادی اور غیر حیدر آبادی تمام معروف شعراء شریک ہوئے، میں بھی اپنے عزیز اور دوستوں کے ہمراہ ایک طویل شوق کے ساتھ مشاعرہ میں شریک ہوا، ظاہر ہے کہ اس قدر ستھری محفل میں کس قدر لطف نہ آیا ہوگا، مگر وہ لطف آج بھی ویسا ہی محسوس ہوتا ہے جب کسی نے "سرور عقل وغم عشق کے دوراہے پر" بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تھے اور جب کسی نے "شب غم کو بے نیاز سحر بنا کر تعینات کے پردے اٹھا دیئے" پر آسمان کی طرف شکر آمیز نگاہوں سے دیکھا تھا! فانی کو پہلی دفعہ دیکھ کر یقین نہ آیا کہ "باقیات" انہی کی تصنیف ہے کیونکہ آجکل بڑے شاعروں کی صورت بھی خاص قسم کی ہوتی ہے۔ ان کا بھرا بھرا جسم تھا، موزوں قد تھا، گندمی رنگ تھا، خدوخال بہت صاف تھے، آنکھیں روشن اور چھوٹی تھیں، چہرہ پر غیر معمولی متانت اور ذہانت کے آثار نمایاں تھے۔ لباس سادہ مگر نفیس تھا، غرض ہم تعجب اور شوق کی فراوانی لئے گھر واپس آئے۔

دوسرے دن محترم دوست حیرت بدایونی سے نیاز حاصل ہوا، میں نے مشاعرہ کا حال بیان کیا اور اپنا شوقِ ملاقات ظاہر کیا، انھوں نے

ایک دن کا تعین کر کے مجھے متعارف کرانے کا وعدہ فرمایا۔

ہم مقررہ دن پر فانی کے گھر پہنچے، فانی ملے پلی[1] کے ایک سرکاری مکان میں قیام پذیر تھے۔ گرمیوں کے دن، شام کے وقت، گھر کے سامنے کے میدان میں چھڑکاؤ کر کے دس بارہ کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ میں اور حیرت صاحب جب پہنچے تو فانی برآمد تھے، ہم کو دیکھتے ہی نہایت خندہ پیشانی سے کھڑے ہو کر حیرت صاحب کو مخاطب فرمایا "آئیے آئیے"

ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے، حیرت صاحب سے میرے متعلق پوچھا "آپ کی تعریف؟"

حیرت صاحب نے مجھے متعارف کرایا، فرمایا "خوب خوب آپ شعر کہتے ہیں غزل سنائیے"۔ میں نے غزل پڑھی جس کا مقطع تھا ؎

تابشؔ یہ مختصر سی ہے رودادِ زندگی
دنیا سے جا رہا ہوں میں دنیا لئے ہوئے

پسند فرمایا اس کے بعد دوسری کی فرمائش کی، میں نے عذر کیا اور ان سے استدعا کی کہ اگر بار خاطر نہ ہو تو کچھ آپ مرحمت فرمائیے، کچھ توقف کے بعد "فیروز" کہہ کر آواز دی، یہ فانی کے بڑے صاحبزادہ تھے وہ آئے تو بیاض منگوا کر غزل سنائی جس کا ایک شعر آج بھی نقش ہے ؎

میری نظروں میں تو بیواسطۂ دید ہے تو
میں بعنوانِ تجلی بھی تجھے یاد نہیں

غزل ایک خاص انداز سے پڑھتے تھے جس میں اپنی ذات کی طرح ایک انفرادیت رکھتے تھے۔ غزل پڑھ کر بیاض بند کر دی، میں نے مزید

---

[1] حیدر آباد کا ایک محلہ۔

استدعا کی۔ فرمایا آپ نے سات شعر سنائے ہیں، میں نے بھی اتنے ہی پڑھے ہیں۔" اس کے بعد حیرت کے اصرار پر دوسری غزل پڑھی، غرض اسی شعر و شاعری میں دو[۲] گھنٹے کی صحبت کے بعد ہم لوگ گھر آ گئے۔

اس ملاقات کے بعد میں تقریباً دو دن بیچ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، فانی سے مل کر میں نے اپنے آپ کو ایک بالکل انوکھے آدمی کے قریب محسوس کیا، انوکھا میں نے اس لئے کہا کہ فانی عام آدمیوں سے بالکل مختلف تھے، "قوائے ظاہری" تمام آدمیوں کے یکساں ہوتے ہیں اور اکثر "قوائے باطنی" بھی، فانی اپنے "قوائے ظاہری" کے اعتبار سے عام لوگوں کی طرح نہ تھے کیونکہ جب میں ان سے ملا ہوں تو وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھے مگر وہ پینتالیس[۴۵] سال سے زیادہ معمر نہ معلوم ہوتے تھے اور موت سے قبل وہ اپنی عمر سے زیادہ ضعیف دکھائی دیتے تھے بالفاظ دیگر ان کے "قوائے ظاہری" کی جوانی سست رفتار تھی اور بوڑھاپا بیحد تیز رفتار، عام حالتوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ "قوائے باطنی" کے اعتبار سے وہ بالکل انوکھے تھے۔ غم ان کی زندگی تھا، اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ رات دن رویا کرتے تھے بلکہ وہ غم سے زندگی حاصل کرتے تھے۔ غم سے غم اخذ کرنا ان کے نزدیک گناہ کے مترادف تھا بلکہ وہ غم سے خوشی حاصل کرنے کو زندگی سمجھتے تھے اور اسی کو منشائے زندگی بھی، وہ صرف نظریات کی حد تک قنوطی نہیں تھے بلکہ عملی طور پر بھی وہ قنوطیت سے خوشی کا فائدہ اُٹھاتے تھے اور انھوں نے اس طرح "نظریۂ قنوطیت" کو دنیا کے سامنے اضافہ کے ساتھ

پیش کیا ہے۔ ان کے تصورات اس دنیا کے تصورات سے مختلف تھے وہ ہر تصور میں "اجتہاد" کو بہت پسند کرتے تھے لیکن "غلط اجتہاد" کو نہیں۔

فطرتاً "جبر کل" کے قائل تھے لیکن آدمی کو کہیں مختارِ کل اور کہیں مجبورِ محض بھی مانتے تھے اور اس نظریہ کی ترجمانی انھوں نے شاید اس شعر میں کی ہے ؎

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی ۔۔۔ سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

فانی اپنی شاعری کے لیے تحریکِ شعر اپنے "اندرونی حواس" سے پیدا کرتے تھے بلکہ یوں سمجھئے کہ وہ بقولِ غالب "اک محشرِ خیال" تھے اور اپنی انجمن خود تھے۔ یہ تحریکِ شعر "ادراکِ غم" ہوتی تھی، یہ غم، نہ غمِ عشق تھا اور نہ غمِ روزگار اس میں شک نہیں کہ یہ "ادراکِ غم" ان میں پیدا ہوا تھا۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار ہی سے "نتیجتہً" وہ دنیا کی نگاہ میں غم سہی لیکن فانی کی زندگی تھا۔

وہ دنیا کی ہر چیز کو "حِس" کی طرح قبول کرتے تھے، ان کی زندگی کی ناکامی کا ایک راز یہ بھی ہے، حالانکہ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو غیر محسوس ہی چھوڑ دینا عقلمندی ہے۔ کردار میں خودداری اور شرافتِ نفس کا جذبہ مکمل تھا، ایک واقعہ اس کی روشن دلیل ہے۔

فانی کی رفیقۂ حیات جس وقت ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوئیں، فانی کے پاس جو کچھ جمع پونجی تھی وہ ان کے علاج میں صرف ہو چکی تھی اور

اب تجہیز و تکفین کے لیئے بھی کچھ نہ تھا، ایسے نازک وقت پر فانی کے ایک مخلص دوست نے جو حیدر آباد کے ایک معزز جاگیر دار ہیں فانی کی مدد کرنی چاہی، بجائے اس کے کہ فانی اس مدد کو شکریہ کے ساتھ قبول کر لیتے، فانی نے ایک خاص انداز میں کہا کہ آپ ایسے نازک موقع پر مجھ کو خریدنا چاہتے ہیں میں آپ کی اس محبت کا بیحد ممنون ہوں!! اگر آپ کو میری کوئی مدد کرنی ہی منظور ہے تو آپ یہ کر سکتے ہیں کہ عرفانیاتِ فانی (جو تازہ تازہ شائع ہوئی تھی) کے چند نسخے خرید لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ان کتابوں سے جو روپیہ جمع ہوا اس سے تجہیز و تکفین ہوئی، اللہ اللہ یہ اس شخص کی زندگی کا واقعہ ہے جو ہمیشہ زندگی میں خود دار رہنے کی ایک کامیاب کوشش بعنوانِ غم ہر نفس کے ساتھ کرتا رہا تھا اور جس نے زندگی کے وہ نشیب و فراز دیکھے تھے جو واقعی دوسروں سے اس کو ممتاز کر گئے، ایسے نازک وقت میں اپنے کردار کی انفرادیت قائم رکھنا فانی ہی جیسے لوگوں کا کام تھا۔

مزاج میں طنز اور مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ طنز میں کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے بلکہ اس ڈھب سے طنز کرتے تھے کہ بیک نگاہ آدمی محسوس بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہی حال مزاح کا تھا۔ ان کے مزاجداں ان کے طنز اور مزاح کو خوب سمجھتے تھے اور خود فانی ایک خاص انداز سے ان لوگوں کی طرف دیکھتے تھے جس کا مطلب وہی لوگ جانتے تھے جن کی طرف انھوں نے دیکھا تھا۔

خوش خُلقی کی وجہ سے اکثر دلچسپ واقعات سے دوچار ہو جاتے تھے،

کبھی ایسا ہوتا کہ فانی کی شہرت سن کر ایسے لوگ ان سے ملنے آتے جن کو شعر کہنے کا سلیقہ تو کجا قدرت نے طبیعت بھی موزوں نہیں دی تھی مگر ادعائے شعر گوئی میں اپنی جگہ منفرد تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ ہم دو چار آدمی پہنچے تو دیکھا کہ محفلِ شعر و سخن گرم ہے اور فانی داد دے رہے ہیں، ہمارے پہنچتے ہی ایک صاحب کو ہم لوگوں سے متعارف کرایا کہ یہ قمر صاحب ہیں بہت عمدہ شعر کہتے ہیں، بیٹھ جانے کے بعد اب جو انھوں نے عروض کی قیود سے آزاد ہو کر شعر سنانے شروع کئے تو خدا کی پناہ! مگر فانی، واہ! سبحان اللہ!! کہے جاتے ہیں۔ بہت دیر کے بعد جب قمر صاحب اپنی دانست میں ہم لوگوں سے کافی دادِ سخن لے چکے تو چلے گئے، بعد میں معلوم ہوا کہ فانی چھ گھنٹے سے ہلاک ہو رہے تھے۔

بعض اوقات فانی بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے جن سے بالکل بچوں کی سی معصومیت ظاہر ہوتی، ایک دفعہ سرِ شام میں اور ہادی بدایونی پہنچے تو دیکھا کہ محلّے کے چند لڑکے فانی کے ارد گرد جمع ہیں اور فانی اپنے اشعار بہت ہی کیف اور ترنّم میں سنا رہے ہیں، یہ دیکھ کر تعجّب ہوا کیونکہ فانی اپنے اشعار بہت کم سنایا کرتے تھے، ہم دونوں کو دیکھ کر کہنے لگے "خوب آئے، دو غزلیں کہی تھیں کوئی تھا نہیں، ان بچّوں کو سنا رہا تھا، اب تم آ گئے ہو، تم بھی سن لو" یہ کہہ کر دونوں غزلیں دوبارہ پڑھیں، غزلیں تھیں جن کے مقطع یہ ہیں ؎

خود تجلّی کو نہیں اذنِ حضوری فانی آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانیؔ کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ اکثر موٹر میں مجھے اپنے ہمراہ لے کر سیر کو دور دور نکل جاتے تھے۔ کبھی شامؔ اکبر آبادی بھی ساتھ ہوتے تھے میں اگر زیادہ عرصہ کے بعد جاتا تو شکایت کرتے اور دوسروں سے بھی مجھے دریافت کرتے اکثر خود بھی آغا پورہ[1] تشریف لے آتے۔

فانیؔ کے حیدر آباد کے ابتدائی دوران قیام میں جوشؔ ملیح آبادی، ہوشؔ بلگرامی، آزادؔ انصاری، حیرتؔ بدایونی وغیرہ اُن کے پاس زیادہ آتے جاتے تھے اور شعر و سخن کی دلچسپ صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ پھر اور دوستوں میں اضافہ ہو گیا تھا، نواب نثار یار جنگ مزاجؔ، ہادیؔ بدایونی، مسعود علی محویؔ، ماہرؔ القادری، ناظمؔ صدیقی، ماسٹر فدا حسین، صدقؔ جائسی، نواب تراب یار جنگ سعیدؔ اور میں اکثر ان کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ فانیؔ بہت دوست پرست اور خلیق تھے ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ اپنے دوستوں کو ترقی دیں لیکن بدقسمتی سے اِس کے باوجود ان کو کوئی دوست میسّر نہ آیا ورنہ زندگی کی تلخیاں شائد کم ہو جاتیں۔

جوشؔ ملیح آبادی اور حکیم آزادؔ انصاری سے ان کے مراسم بہت خاص تھے ان دونوں کی قربت میں فانیؔ بہت خوش نظر آتے تھے اور یہی حال ان دونوں کا تھا۔ پرانی صحبتوں اور انجمن آرائیوں کے تذکرے، نئی دلچسپیوں کی تمہیدیں، شعر و شاعری کی پُر کیف ساعتیں اور پھر

[1] ایک محلہ جس میں میرا مکان تھا۔

آپس کی بے تکلّفی عجب مزا دیتی تھی۔

جامعہ عثمانیہ میں "یومِ جامعہ" کے سلسلہ میں ہر سال ایک مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ غالباً ۴۷ف میں مہاراجہ بہادر کی صدارت میں ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا، فانیؔ اور میں اڈیکمیٹ[1] شرکتِ مشاعرہ کے لئے گئے، راستہ میں بارش ہو گئی جس کی وجہ سے تمام فضا بھیگ گئی، منظر کی پُر کیف تبدیلی سے فانیؔ متاثر ہو کر گنگنانے لگے، شعر پڑھا ؎

ہے کا آنسوؤں بھری آنکھوں میں پا تراب ہے
آ کہ حیاتِ مستعار نقش بُرُوئے آب ہے

اس کے بعد کہنے لگے کہ سید سلیمان صاحب ندوی نے اس شعر پر اعتراض کیا ہے" میں نے اُن سے پوچھا کہ ان کو اس پر کیا اعتراض ہے؟ کہنے لگے" انھوں نے 'پا تراب' کو 'پایاب' کے معنی میں سمجھا، میں نے جب واضح طور پر "پا تراب" کے معنی بیان کئے تو اپنی سہو نظری کو انھوں نے قبول کر لیا۔

پھر تمام کلام کی اشاعت کا ذکر ہونے لگا، فرمایا" مہاراجہ بہادر کا ارادہ ہے کہ وہ اس کو شائع کرائیں، اس پر وہ کچھ لکھ بھی رہے ہیں" انہی باتوں میں ہم جامعہ پہنچ گئے۔

حفیظ جالندھری حیدر آباد آئے ہوئے تھے، مشاعرہ اپنے شباب پر تھا۔ حفیظ نے اپنا "شاہنامہ اسلام" سنایا اس کے بعد فانیؔ نے "کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے" اور "کچھ آپ بھی کہیں گے مری التجا کے بعد"

---

[1] وہ علاقہ جس میں جامعہ ہے۔

یہ دو غزلیں پڑھیں، مشاعرہ سے کوئی ڈیڑھ کے عمل میں ہم واپس ہوئے، واپسی پر مشاعرہ پر تبصرہ ہوتا رہا۔

ایک دن میں نے کہا، فانی صاحب! "سنا ہے کہ آپ داغ دہلوی کے شاگرد ہیں؟" کہنے لگے میں نے صرف ایک غزل بذریعہ خط اصلاح کیلئے روانہ کی تھی اس کے بعد پھر کوئی اصلاح نہیں لی۔" اسی سلسلہ میں میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اپنے اشعار پر اصلاح ان سے لیا کروں، کہنے لگے "اگر تم کو خیاطی سیکھنی ہے تو اور بات ہے کیونکہ اس میں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کتر بیونت کپڑے کی کس طرح ہونی چاہیئے، اس میں شک نہیں کہ شعر کہنے کے لئے مبادیاتِ شعر سے واقفیت نہایت ضروری ہے جو مطالعہ سے آسکتی ہے مگر شاعری مطالعہ سے نہیں آسکتی وہ ودیعت ہوتی ہے اور فطری شاعر کو شاعری سیکھنے کی ضرورت نہیں اب اگر تم اپنی شاعری کو استادی کا محتاج سمجھتے ہو تو ایسی شاعری فوراً چھوڑ دو۔" پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا "بعض لوگ شعر کو صرف آرٹ سمجھتے ہیں حالانکہ شعر کو شعر پہلے ہونا چاہیئے یعنی شعریت شعر میں پہلے ہونی چاہیئے، بعد کو آرٹ، اس کے بعد ان پر عمر بھر جو اعتراضات ہوتے رہے ان کا تذکرہ کرنے لگے پھر تھوڑے وقفہ کے بعد فرمایا "میں نے نشر کرنے کے لئے ایک مضمون اسی موضوع پر لکھا ہے اس کو ضرور سننا۔ یہ مضمون بعد کو رسالہ سب رس میں شائع ہوا۔

میں نے ایک دفعہ پوچھا کہ آپ کو فارسی شعراء میں کون زیادہ پسند ہے؟" فرمایا کہ "غالب اور نظیری"، غالب کا فارسی کلام بہت یاد تھا، غالب

اور نظیری کی غزلوں کے اکثر اشعار سنائے جن میں کا یہ شعر مجھے یاد ہے ؎

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود　　　لیک صنم بہ سنگِ درناصیہ مشترک نخواست

اردو کے متقدمین شعراء میں میر، مومن اور غالب کے مداح تھے، مومن کا یہ شعر اکثر پڑھتے تھے ؎

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

موجودہ دور کے شعراء میں، آرزو لکھنوی، یاس یگانہ، حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، مانی جائسی، شاد عظیم آبادی وغیرہ کو بہت پسند کرتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ میں اور حسرت موہانی بزمانہ تعلیم علی گڑھ میں ایک ہی اقامت خانہ میں رہتے تھے تقریباً بلاناغہ ایک دوسرے کو شعر سنایا کرتے تھے ایک دن حسرت نے غزل سنائی جس میں شعر تھا ؎

اب عشق کو درکار ہے اک عالمِ حیرت　　　کافی نہ ہوئی وسعتِ میدانِ تمنّا

مجھے بیحد پسند آیا اور میں نے سہ غزلہ کہا لیکن ایسا شعر نہ نکلا۔ "اچھے شعر کی جی کھول کر داد دیتے تھے حسرت موہانی کا یہ شعر اکثر پڑھتے تھے ؎

بس کھل گئی حقیقتِ نقاشیٔ خیال　　　اپنے ہی رنگ بھر دیئے تصویرِ یار میں

خود اپنے پسندیدہ اشعار کی ایک بیاض مرتب کی تھی جس میں فارسی اور اردو کے اشعار تھے جس کو طبع کرانے کا ارادہ رکھتے تھے مگر موت نے بہت سے ارادے پورے نہ ہونے دیئے۔ موجودہ دور کے "غلط اجتہاد شعری" پر بہت آزردہ ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ آجکل چونکہ سامعین کا ادبی ذوق اچھا نہیں ہے اس لئے یہ غلط اجتہاد پسند کیا جاتا ہے۔

ایک دن میں نے کہا کہ" فانیؔ صاحب آپ نے کبھی دہلی کے کسی مشاعرہ میں شرکت نہیں کی؟" فرمایا" میں ایک دفعہ ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرہ میں مدعو تھا اور شرکت کے لئے گیا بھی تھا، ہوٹل میں ٹھہرا، غزل بھی کہی تھی جس کا شعر یہ تھا ؎

وحشت بقیدِ چاکِ گریباں روا نہیں دیوانہ تھا جو معتقدِ اہلِ ہوش تھا

لیکن شرکتِ مشاعرہ کے لئے نکلا، راستہ میں ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہاں مشاعرہ کہاں ہے، انھوں نے جواب دیا کہ یہاں کوئی "شاعری" وغیرہ نہیں ہے یہ سُن کر مجھے بیحد رنج ہوا اور میں نے کہا کہ اللہ اکبر! یہ وہ دلّی ہے جہاں میر، مومن اور غالب پیدا ہوئے، بس اُلٹے پیروں ہوٹل آیا اور اسٹیشن چلا گیا۔

دہلی کے لوگوں میں بیخود، سائل، ساحر اور اکبر حیدری کا اکثر ذکر کرتے تھے اور کہا کرتے کہ" میں نے دہلی کی بہت خاک چھانی ہے علی گڑھ سے دوسرے تیسرے دن تھیٹر دیکھنے دلّی جایا کرتا تھا" دہلی کے ذکر میں فرماتے تھے کہ علی گڑھ میں ایک مشاعرہ میر مہدی مجروح کی صدارت میں ہوا میں نے غزل پڑھی تو ایک شعر میر مجروحؔ نے بہت پسند کیا (مجھے اس شعر کا صرف دوسرا مصرعہ یاد ہے) ؏

وہ بھی صرفِ کشمکشہائے تماشا ہو گیا

مجروحؔ ذرا اونچا سنتے تھے میں نے ذرا اونچی آواز سے شعر مکرر پڑھا بہت پسند کیا اور دعا دی"، میں نے کہا کہ" دعا تو با اثر تھی"، ہنس کر خاموش

ہو گئے۔ لکھنؤ کو بہت یاد کرتے تھے۔ ان کی زندگی کی مختصر رنگینیاں ان کو زیادہ تر اٹاوہ، لکھنؤ اور کم تر آگرہ میں مقسوم ہوئی تھیں۔ لکھنؤ کے شعراء میں آرزو، وصل بلگرامی اور اثر وغیرہ کا اکثر ذکر کرتے تھے، آگرہ کے دوستوں میں امام اکبر آبادی مانی جائسی وغیرہ کی صحبتوں کا مزے لے لے کر تذکرہ کرتے تھے۔

ایک دفعہ مجھ سے پوچھا "تابش تم پر کبھی ایسا بھی واقعہ گذرا ہے کہ تم اکثر آدمیوں کو اور اکثر مقامات کو دیکھ کر ایسا محسوس کرتے ہو کہ یہ آدمی اور یہ مقام پہلے کہیں تم نے دیکھا ضرور ہے" میں نے کہا کہ "ہاں آدمیوں اور بعض واقعات کی حد تک تو ایسا محسوس ہوتا ہے" کہنے لگے "میں دہلی کے لال قلعہ میں گیا اور دیوانِ خاص کے قریب جن عمارتوں میں سے ایک نہر بہتی ہے ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ یہ میرا محل ہے اور میں یہاں رہتا تھا اور یہاں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ غرض یہ جذبہ مجھ پر اس قدر طاری ہوا کہ میں بے اختیار رویا اور بہت دیر تک وہاں بیٹھ کر ان مقامات کو دیکھتا رہا وہاں سے اٹھ کر اپنی اس حماقت پر خوب ہنسا۔"

تھوڑی دیر بعد کہنے لگے "بتا سکتے ہو یہ کیا بات ہے؟" میں نے کہا "میں معذور ہوں" فرمایا قرآن میں ایک آیت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہر روح کو جدید طور پر دوبارہ خلق کریں۔" شائد یہ دنیا اور اس دنیا کی ہر چیز۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت دکھانے کے لئے خدا جانے کتنی دفعہ خلق کی ہو اور ہم سب بھی جدید طور پر خلق ہوئے ہوں اور پچھلی باتیں ایک خواب کی سی کیفیت لئے ہوئے ہمیں محسوس کرائی جاتی

ہوں کہ ہم نے یہ تمام چیزیں اس سے قبل بھی کہیں دیکھی ہیں" ذرا وقفہ کے بعد کہا واللہ اعلم بالصواب۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اکثر کہا کرتے تھے کہ "اس دنیا میں ایک چیز بھی بے جگہ نہیں ہے حتیٰ کہ ایک ذرہ بھی اور موت جس کو کہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ جو چیز اپنے ماحول میں بے جگہ (MIS-PLACED) معلوم ہوتی ہے وہ ہٹا دی جاتی ہے میں اب یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں بھی اپنے ماحول میں اجنبی سا ہوتا جا رہا ہوں" میں نے فوراً موضوعِ گفتگو بدل دیا۔

ہاشم علی خان صاحب رکن عدالت العالیہ سرکار عالی اور فانی ایک دوسرے سے بہت مانوس تھے، ہاشم علی خان صاحب فانی کی مالی امداد کا بھی ذریعہ بنے، فانی کی ملازمت کا سلسلہ جب ختم ہو گیا تو ہاشم علی خاں صاحب نے ان کو عدالت سے کچھ کمیشنز (COMMISSIONS) دلانے شروع کر دیئے تھے جس سے کسی حد تک فانی کی مالی مشکلات میں آسانی ہوئی۔

حفیظ جالندھری حیدرآباد آئے، یہ ان کا دوسرا پھیرا تھا، ہاشم علیخاں صاحب نے ایک دعوت بہت اعلیٰ پیمانہ پر ترتیب دی، اپنے مخصوص دوستوں اور عزیزوں کو مدعو کیا جن میں سے علی یاور جنگ، مہدی نواز جنگ، علمدار حسین اور پروفیسر ضیاء الدین انصاری قابلِ ذکر ہیں، ان کے علاوہ فانی، حفیظ جالندھری، ماہر القادری اور میں بھی شریک تھے، رات گئے تک یہ پُر کیف صحبت قائم رہی، فانی نے ایک عجیب انداز سے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا۔

دل کو مٹا کر روح کو تن سے حکم نہ دے آزادی کا
کوئی تماشا دیکھنے والا چاہیئے اس بربادی کا

اس صحبت کے بعد حفیظ فانی سے ملنے کئی بار ان کے گھر آئے اور جب بھی آئے شاعری کی نشست ضرور ہوئی۔

فانی کا آخری مجموعہ وجدانیاتِ فانی، فانی نے ہاشم علی خان صاحب ہی کے نام سے معنون کیا تھا، مگر طباعت کی خرابی سے شاید وہ دوبارہ طبع کرایا گیا۔ اس میں عرفانیاتِ فانی کے بعد کی چند غزلیں اور کچھ قطعات شامل ہیں۔

کئی سال ہوئے جگر مراد آبادی حیدر آباد تشریف لے گئے۔ فانی کے یہاں مقیم ہوئے، شعر و سخن کی مجلسیں سجنے لگیں، دن رات شاعری اور شعراء موجود رہتے ان میں سے اکثر شعراء ایسے تھے جن سے خود جگر صاحب بھی گریز کرتے تھے مگر وہ ہیں کہ موجود ہیں اور مع بیاض موجود ہیں۔ فانی اکثر اپنی اور ان کی جان چھڑانے کے لئے موٹر میں بیٹھ کر ایک دو آدمیوں کو ساتھ لے کر یا تو قاضی عبد الغفار کے یہاں یا نواب اصغر یار جنگ کے یہاں چلے جاتے تھے اور وہاں ایک دو گھنٹے پُر لطف طریق سے صرف کر کے واپس آجاتے تھے، ہم لوگوں نے جگر صاحب کے اعزاز میں ایک مشاعرہ راجہ پرتاب گیر جی کی کوٹھی میں ترتیب دیا۔ مولوی عبد الحق صاحب (سیکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند) کو صدر بنایا اور سامعین میں نہایت انتخاب کے ساتھ لوگوں کو جمع کیا جن میں سید ہاشمی فرید آبادی، مولانا مسعود علی محوی، نواب منظور جنگ، نواب نثار یار جنگ، راجہ پرتاب

گیوجی، پروفیسر عبدالحمید اور پروفیسر سروری قابلِ ذکر ہیں، شعرا میں فانی، جگر، حیرت بدایونی، شام اکبرآبادی، وجد حیدرآبادی وغیرہ تھے ان کے علاوہ مولانا محوی، سید ہاشمی فرید آبادی وغیرہ نے بھی اپنا کلام سُنایا مشاعرہ کی خصوصیت اور نوعیت کو دیکھ کر فانی نے فرمایا "تابش میری عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہے میں نے ایسا مشاعرہ نہیں دیکھا" فانی مشاعروں سے ہمیشہ دور رہتے تھے اور اس قدر دور رہتے تھے کہ لوگوں کو ان کے متعلق غلط فہمی ہوگئی تھی جب مشاعروں کا ذکر آتا تو ہمیشہ بیزاری کا اظہار کرتے، کہتے تھے کہ یا تو مشاعروں سے طرح کا رواج اُٹھا دینا چاہئے یا کم از کم ایک درجن مصرعہ ہائے طرح ہونے چاہئیں تا کہ ہر شخص آزادی سے شعر کہہ سکے۔

فانی شعر کم کہتے تھے، میں نے پوچھا کہ آپ شعر کس طرح اور کب کہتے ہیں؟ کہنے لگے "دو ماہ میں ایک غزل کی اوسط ہے وقت مقرر نہیں اور ضرورت سے بھی بعض وقت شعر کہنے پڑ جاتے ہیں جو مجھے ناپسند ہوتے ہیں۔

فانی معظم جاہ بہادر کے یہاں اکثر جاتے تھے وہاں نجم آفندی، شاہد صدیقی اور معز الدین سے خوب صحبتیں رہتی تھیں، معظم جاہ بہادر فانی کا احترام کرتے تھے۔

جب سے جنگ چھڑی اس وقت سے لڑائی کے حالات پر بحث زیادہ کرتے تھے، ہندوستان کی حفاظت اور اس کے دفاع پر اکثر باتیں ہوتیں ہر خبر اور افواہ پر مدلّل حجت کرتے اور اس کا جھوٹ سچ معلوم کر کے چین لیتے۔

ان کی رفیقۂ حیات ان کے لئے زیادہ مہلک ثابت ہوئیں چنانچہ ان

کے انتقال کے بعد فرمایا کہ "ہم بھی اب زیادہ نہیں جئیں گے۔" چنانچہ اپنی وفات کا مادہ تاریخ خود ایک قطعہ میں کہا جو یہ ہے۔

اُو از جہاں گذشت کہ آخر خدا نہ بُود — اُو آں چناں بہ زیست تو گوئی خدا نہ داشت

طغیانِ ناز بیں کہ بہ لوحِ مزارِ اُو — ثبت است سالِ رحلتِ فانیؔ "خدا نہ داشت" ۱۳۶۰ھ

میں نے اس کو نوٹ کر لیا فرمایا "جھوٹ سچ دیکھنے کے لئے لکھ لیا ہے؟" اس کے بعد ہنسے اور خاموش ہو گئے۔

حیدر آباد (دکن) میں یہ دلچسپ صحبتیں گذارنے کے بعد میں اپنے حالات سے مجبور ہو کر ہمیشہ کے لئے دہلی آگیا۔ دو مہینہ کے بعد اخبار میں یہ جانکاہ خبر پڑھی کہ آج ہندوستان سے وہ اُٹھ گیا جس پر ہندوستان صدیوں ناز کرے گا۔ ایک شعر جو صرف ایک ہی شعر رہا موت سے کوئی چھ ماہ قبل کہا تھا۔

شام سے پہلے مرتے ہیں یا آخر شب تک جیتے ہیں؟
ان کے بغیر نہ جینے والے دیکھئے کب تک جیتے ہیں؟

۲۶ر اگست ۱۹۴۱ء کو اُن کے اُس خوابِ مرگ کی تعبیر ملی جو انھوں نے عمر بھر دیکھا اور اس سوال کا جواب ان کو آخر مل ہی گیا ـــــ افسوس !!!۔ زندگی میں تلخیوں نے ایک لمحہ بھی خوش کام نہ رہنے دیا !!! خود بھی وہ غم زدہ رہے اور اپنے احباب کو بھی ہمیشہ کے لئے غم زدہ چھوڑ گئے اور وہ دن بھی آخر آ پہنچا جس دن کے لئے فانیؔ آرزومند تھے۔

ایسا بھی کوئی دن مری قسمت میں ہے فانیؔ
جس دن مجھے مرنے کی تمنا نہ رہے گی

حضرت جگر مراد آبادی - کچھ یادیں

اِس دور کے غزل کے عناصرِ اربع میں حضرت جگر مراد آبادی کا نام نامی ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

جگر صاحب نے شاعری اور شخصیت دونوں اعتبار سے ہماری شاعری اور تہذیب پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں' شاعری میں ہمیشہ پاکیزہ خیالات کا اجرا' اور محبت کے صالح جذبات کی اشاعت ان کا موقف رہا انھوں نے حُسن و محبت کے محاکات میں ہمیشہ تجدید کا خیال رکھا اور اس طرح وہ اپنی پاکیزہ سرشار شاعری کی نغمگی سے دلوں کو گرماتے رہے۔ اس مضمون میں ان کی شاعری موضوع گفتگو نہیں ہے بلکہ بعض یادوں کو تازہ کرنا مقصود ہے

جگر صاحب نہایت اعلیٰ کردار کے مالک تھے' وہ پرانی تہذیبی قدروں کی پاسداری اور حفاظت اپنی میراث کی طرح کرتے اور اسلاف کی ثقافتی نشانیوں کو حرزِ جاں رکھتے۔ بزرگوں کا ادب' دوستوں کی خاطر مدارات' اہلِ علم و دانش کی خدمت' ناداروں کی دستگیری' ہم عصروں کا احترام' چھوٹوں سے محبت' عیب بینی اور غیبت سے اعراض' غرض انسانی اقدارِ اعلیٰ کا فروغ ان کا وتیرہ تھا اور انہی خوبیوں نے جگر صاحب کی شخصیت کو نہایت دل پذیر بنا دیا تھا' اُن سے ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملنے کی خواہش ہوتی۔ وہ لوگوں کے ذہن اور اپنا ذہن ایک سطح پر لا کر ملتے اور اس طرح احساسِ برتری یا احساسِ کمتری سے خود کو بھی محفوظ رکھتے اور دوسروں کو بھی۔ جگر صاحب ہر مذاق کے لوگوں میں اپنے لئے جگہ بنا لیتے۔

مجھے جگر صاحب سے نیاز مندی کا شرف ۱۹۳۸ء سے حاصل رہا لیکن ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء میں جگر صاحب کا کراچی میں طویل قیام اس شرف میں مزید اضافہ کا سبب بنا۔ ان کی شفقت اور محبت میرے لئے۔ ع

کرمہائے تو مارا گستاخ کرد

کا مصداق تھی۔ میرے علاوہ ماہر القادری' اقبال صفی پوری' ادیب سہارنپوری' شعیب حزیں رُوز

کیا بلکہ ہر وقت کے حاضر باش تھے اور گستاخانہ حد تک اُن سے بے تکلف تھے اور جگر صاحب کا بھی یہ عالم تھا کہ ہم میں سے اگر کوئی بھی کسی روز غیر حاضر ہو جاتا تو بے چین رہتے۔ جگر صاحب کا فرصت کا بہترین مشغلہ رمی (تاش کا کھیل) تھا وہ اس قدر انہماک سے رمی کھیلتے کہ دوسری باتوں کا انہیں بالکل ہوش نہ رہتا اور اس سلسلہ میں لطائف بھی ظہور میں آتے مثلاً ایک شاعر نے جگر صاحب کی فرمائش پر رمی کے دوران میں اپنا کلام سنایا اور داد کی بجائے جگر صاحب کے منہ سے نکلا "یہ ہے پان کا چوا" اور شاعر ہکا بکا رہ گیا کہ یہ کیا ہوا۔ جگر صاحب ملنے والوں کی یلغار سے تنگ آکر نہایت خاموشی سے اصطفیٰ منزل سے نکل کر میرے غریب خانہ آجاتے اور دو تین دن میرے یہاں رہتے، میری چھوٹی بیٹی رشیقہ سے دو تین سال کی تھی بہت پیار کرتے تھے، میرا قیام جہانگیر روڈ کے سرکاری کوارٹروں میں تھا انہی کوارٹروں میں سلیم احمد اور جام نوائی بدایونی بھی رہتے تھے، میرے یہاں بھی رمی کی بھڑ جمتی اور یہ دونوں بھی جگر صاحب کے ساتھ رمی کھیلتے اور یوں کئی کئی راتیں اور دن گذر جاتے

ایک عقیدت مند نے عمدہ قسم کی دو قراقلی ٹوپیاں جگر صاحب کو پیش کیں، ایک صاحب نے ان میں سے ایک ٹوپی چرالی اور وہ اُسے رُوز پہن کر جگر صاحب کے پاس آتے رہے۔ لیکن جگر صاحب سے یہ نہ ہو سکا کہ وہ اُن سے کہتے:

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ایک روز ایک صاحب نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی جگر صاحب کی شیروانی سے ان کا بٹوہ نکال لیا اور یہ حرکت جگر صاحب نے دیکھ لی لیکن جگر صاحب نظریں چرا گئے اور ان کو شرمندگی سے بچا لیا۔

جگر صاحب اور جوش صاحب ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے اور یہ بات سب کو معلوم تھی جگر صاحب کی خوشنودی کے لئے ایک صاحب نے جگر صاحب سے جوش کے عیب بیان کرنے شروع کر دیئے، جگر صاحب نہایت خفا ہوئے اور کہا کہ جوش کو میں برا کہہ سکتا ہوں آپ ان کے مرتبے کے آدمی نہیں اور یہ حق آپ کو ہرگز نہیں ہے کہ آپ بڑے شاعر کی برائی مجھے خوش

کرنے کے لئے کریں۔

ہم عصر شعراء میں جگر صاحب حضرت اصغر گونڈوی کے بعد سب سے زیادہ حضرت فانی بدایوانی کو بحیثیت شاعر اور بحیثیت انسان پسند کرتے تھے، اور ان کے قصے اکثر بیان کیا کرتے تھے، کہنے لگے ایک دفعہ کسی نے ایک مصرع دیا۔ ع

تیرے وحشی کے گریبان سے جاتے ہیں

اور فی الفور دوسرا مصرع کہنے کی فرمائش کی حضرت فانی کا مصرع سب سے اچھا تھا ؎

تیرے وحشی کے گریباں سے جاتے ہیں
"دل پہ پڑتے ہیں وہ ٹانکے جو دئے جاتے ہیں"

جناب فضلی صاحب نے ملیر میں ایک پکنک کا اہتمام کیا یہ پکنک دو تین روز کی تھی۔ اس میں جگر صاحب کے علاوہ مَیں، ماہر القادری، ادیب سہارنپوری، اقبال صفی پوری، اسمٰعیل احمد مینائی، خود فضلی صاحب اور دوسرے لوگ شریک تھے، وہاں بھی رمی کی محفلیں جمیں، کرکٹ کھیلی گئی، ایک روز طے پایا کہ "حاضر مشاعرہ" کیا جائے اور مصرع طرح کا جگر صاحب دیں گے۔ چنانچہ جگر صاحب نے مصرع دیا۔ ع

شمع میں جلتا نظر آیا ہے پروانہ مجھے

شعر کہنے کے لئے دو گھنٹے مقرر ہوئے، سب نے دو دو تین تین شعر کہہ لئے لیکن خود جگر صاحب سے ایک شعر بھی نہ ہو سکا۔

ریڈیو پاکستان حیدر آباد نے ایک کل پاکستان طرحی مشاعرہ کا اہتمام کیا طرحی مصرع تھا۔

ع۔ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

کراچی سے جگر صاحب، مَیں، ماہر القادری، ارم لکھنوی، اقبال صفی پوری، ادیب سہارنپوری، سراج الدین ظفر، اور پاکستان کے دوسرے علاقوں کے شعراء بھی مدعو تھے۔ اِن میں حفیظ جالندھری بھی تھے۔ جگر صاحب راستے بھر طرح میں شعر کہتے رہے، کوئی شعر ہو جاتا مجھے سناتے، ایک شعر بہت

خوش ہو کر سنایا ؎

غنیمت ہے چشمِ تغافل بھی اُن کی
بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں

میں نے کہا جگرؔ صاحب یہ شعر جہاں اُستاد حضرت داغ دہلوی کا ہے۔ فوراً کاٹ دیا اور کہا لاحول ولاقوۃ الا باللہ

جگرؔ صاحب کی اگر کسی نے دعوت کی ہے تو دعوت میں جاتے وقت جتنے حضرات موجود ہوں گے ان کو جگرؔ صاحب بہ اصرار دعوت میں لے جائیں گے، دعوت کرنے والے بھی جگرؔ صاحب کی اس عادت سے واقف ہوتے اور وہ اسی حساب سے دسترخوان کا اہتمام رکھتے، اور اسی طرح ناخواندہ مہمان اور میزبان شرمندگی سے بچ جاتے۔

ایک دفعہ اردو کالج کراچی کے پرنسپل میجر آفتاب حسن نے اُردو کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں ایک وفد لے کر کوئٹہ جانے کا پروگرام بنایا کیونکہ کوئٹہ بلوچستان کے اکثر سردار علی گڈھ کے تعلیم یافتہ تھے اور اُنھیں یقین تھا کہ وہ اردو کالج کی مالی امداد کریں گے۔ اس وفد میں، جگرؔ صاحب، ماہرؔ القادری، ادیبؔ سہارنپوری، سیّد محمد جعفری، اقبالؔ صفی پوری اور اسمٰعیل مینائی شامل تھے، کوئٹہ پہنچ کر بعض لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور کچھ رقم بھی مل گئی۔ میرا تعلق چونکہ ریڈیو سے تھا اس لئے میں کوئٹہ ریڈیو پاکستان گیا اور اسٹیشن ڈائریکٹر کے۔ جی۔ علی سے جو آل انڈیا ریڈیو دلّی میں میرے شریک کار تھے ملا، انھوں نے بتایا کہ کوئٹہ ریڈیو اسٹیشن کا باقاعدہ افتتاح کرنے زیڈ۔ اے بخاری کنٹرولر ریڈیو پاکستان آ رہے ہیں، اور اس سلسلے میں خاص پروگرام ترتیب دیا گیا ہے جس میں ایک مشاعرہ بھی رکھا ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ اتفاق سے کوئٹہ میں جگرؔ صاحب وغیرہ موجود ہیں کیوں نہ ان کو بھی مدعو کر لیا جائے۔ کے۔ جی۔ علی نے کہا کہ ہم مدعو تو کر لیں لیکن مقامی فیس سے زیادہ ہم نہیں دے سکیں گے کیونکہ ہم نے انھیں کوئٹہ میں مدعو نہیں کیا ہے، میں نے ان سے کہا کہ میں شعراء کی رضامندی لے لوں گا، چنانچہ میں نے جگرؔ صاحب وغیرہ سے رضامندی لے کر ان کو آگاہ

کردیا اور اس طرح ریڈیو پاکستان کوئٹہ کا مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ دوسرے روز جگر صاحب کہنے لگے کہ بعض اوقات دوستی میں مالی نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے' یہ اشارہ مشاعرہ کی مقامی فیس کی طرف تھا' اس گفتگو کے بعد میں کبیدہ خاطر رہا اور کراچی آنے کے بعد جگر صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا' کئی دن گذر گئے' جگر صاحب نے احباب سے میری غیر حاضری کا ذکر کیا' احباب نے مجھے بتایا' میں نے کہا جگر صاحب سے کہئے میں خفا ہوں۔ آپ یقین کریں گے جگر صاحب مجھے منانے آئے' سوء اتفاق کہ ذاتی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کے بعد بھی میں حاضر خدمت نہ ہو سکا۔ جگر صاحب دوبارہ آئے اور اس مرتبہ خالی ہاتھ نہیں آئے' مٹھائی کا ڈبہ' میری بیوی کے لئے عطر کی شیشی' اصغر حسین دلدار حسین کا پان کا زردہ (تمباکو) لے کر آئے' ہائے کیا لوگ تھے' کیسی محبتوں سے ان کا خمیر اٹھا تھا!!

مجھے معلوم تھا کہ بخاری صاحب اور جگر صاحب ایک دوسرے سے کبیدہ ہیں اور ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے ہیں اور میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا کہ ان دونوں کا میل ہو جانا چاہیئے' چنانچہ میں نے بخاری صاحب سے اِس خواہش کا اظہار کیا' بخاری صاحب آمادہ ہو گئے' میں نے کہا شرط یہ ہے کہ پہل آپ کریں گے۔ اُدھر میں نے جگر صاحب کو بھی آمادہ کر لیا' غرض ایک دن میں اور بخاری صاحب جگر صاحب کی قیام گاہ پہنچے' سوء اتفاق سے جگر صاحب موجود نہیں تھے' بخاری صاحب اپنی آمد کے متعلق ایک پرچہ چھوڑ آئے تھوڑی دیر بعد جگر صاحب آ گئے' انھیں بخاری صاحب کے آنے کا علم ہوا' فوراً بخاری صاحب کے دفتر پہنچے دونوں دیر تک ایک دوسرے سے بغل گیر رہے اور دونوں آب دیدہ تھے' یہ منظر دیکھنے کا تھا' پھر بخاری صاحب نے خود جگر صاحب کی کئی غزلیں ریڈیو پاکستان کے لئے ریکارڈ کیں اور جگر صاحب نے اصطفیٰ منزل میں دو مشاعرے بخاری صاحب کی صدارت میں کئے۔

جگر صاحب ہونہار نوجوان شعراء کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے' راز مراد آبادی' شکیل بدایونی' مجروح سلطان پوری' دور ہاشمی' خمار بارہ بنکوی' نظر امروہوی وغیرہ کو دراصل انھوں ہی نے متعارف کرایا' برصغیر کے ہر اچھے مشاعرے میں ان کو مدعو کراتے اور اس طرح ان شعراء کی شہرت میں جگر صاحب کا بڑا دخل رہا۔

کراچی میں ایک مشاعرہ طیلسانینِ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے، سابق کنٹرولر آل انڈیا ریڈیو، اقوامِ متحدہ کے ڈپٹی سکریٹری جنرل جناب پطرس بخاری کی صدارت میں کرایا اس میں پاکستان کے دوسرے علاقوں کے شاعر بھی شریک تھے انہی شاعروں میں ساحر صدیقی بھی تھے انھوں نے مشاعرہ لوٹ لیا، ساحر صدیقی میرے یہاں مقیم تھے، دوسرے روز علی الصباح جگر صاحب ساحر صدیقی سے ملنے آئے اور ان کی بہت حوصلہ افزائی اور تعریف کی، میں نے کہا جگر صاحب آپ نے کیوں زحمت کی، ساحر صدیقی خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، جگر صاحب ہونہار شاعروں کی حوصلہ افزائی میں اپنے مرتبہ کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے۔

کراچی میں ہندوستان کی ایک مقبوضہ مسلم ریاست کی شہزادی کو شاعروں اور شاعری سے بڑا شغف تھا وہ خود بھی بہت عمدہ ترنم سے شعر پڑھتی تھیں، اُن کے یہاں روز دعوتیں اور مشاعرے ہوتے، میرے سوا کراچی کے تمام شعراء اِن محفلوں میں شریک ہوتے رہتے، ایک دن جگر صاحب نے مجھ سے ان کے یہاں چلنے کے لئے کہا میں نے عرض کیا کہ میں بغیر دعوت کے نہیں جاؤں گا، چنانچہ ایک دن شہزادی صاحبہ خود مجھے مدعو کرنے آئیں، مقررہ تاریخ پر میں جگر صاحب کے ہمراہ ان کے یہاں شریکِ محفل ہوا۔ تمام انتظام نہایت شاہانہ تھا، کھانے کے وقفہ میں مَیں نے دیکھا کہ جگر صاحب موجود نہیں ہیں اور جگر صاحب کی عدم موجودگی سے میں نے اپنے آپ کو اس محفل میں بیگانہ محسوس کیا اور جگر صاحب کا یہ انداز مجھے بڑا عجیب لگا گویا اس طرح جگر صاحب مجھے وہاں چھوڑ کر خود غائب ہو گئے اور میں صبح تک اِس محفل میں شعر سُناتا اور سُنتا رہا۔

یہ ہیں ایک انسان کی شخصیت کی مختلف جھلکیاں، اِن جھلکیوں میں کردار کی عظمت کی کتنی جہتیں ہیں اور یہی مختلف جہتیں انسان کو فرشتوں پر فضیلت دیتی ہیں، جگر صاحب بھی فرشتہ نہیں انسان تھے اور یہی شرف ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

ع   خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

جوش حیدر آباد دکن میں

تابندہ باش حضرت تابش

محبت نامہ ملا۔ جی خوش ہو گیا۔

بیمار ہوں زیادہ لکھا نہیں جاتا۔

آپ کا محبِ صادق

جوش

اسلام آباد

٢٤/٣/٨١

میں ۱۹۲۵ء میں حیدر آباد دکن پہنچا۔ میرے نانا مولوی عنایت اللہ صاحب جو شمس العلماء منشی ذکاءاللہ صاحب کے صاحبزادے تھے ناظم دارالترجمہ تھے۔ حیدر آباد کا یہ زمانہ گوناگوں ترقیوں کا زمانہ تھا اور اسی کے ساتھ حیدر آباد کی علمی اور ادبی فضا بھی نہایت سازگار تھی۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہو چکا تھا اور برِصغیر کے تقریباً تمام اہلِ علم اور اہلِ کمال یہاں جمع تھے۔ ان میں مولانا نظم طباطبائی، مرزا ہادی رُسوا اور جلیل مانک پوری کے علاوہ، الیاس برنی، مولانا عبداللہ عمادی، وحیدالدین سلیم پانی پتی، مولوی عبدالحق، پرفیسر سجاد مرزا، مولوی عبدالقدیر

بدایونی، ہوش بلگرامی، نواب نثار یار جنگ، یاس یگانہ، ضامن کنتوری، حیرت بدایونی، باغ بدایونی، آغا حیدر دہلوی وغیرہ وغیرہ بھی علمی اور ادبی محفلوں کی رونق تھے۔

۱۹۲۷ء میں حضرت جوش حیدر آباد پہنچے اور چند مہینوں قیام کرنے کے بعد واپس چلے گئے اور ۱۹۲۹ء میں دوبارہ حیدر آباد آئے اور دارالترجمہ میں ناظر ادبی کی حیثیت سے ملازم ہوگئے جوش صاحب حیدر گوڑہ (قدیم نام نرائن گوڑہ) میں رہتے تھے اور ان کا گھر مولوی عنایت اللہ صاحب کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ جوش صاحب نہایت خوبصورت آدمی تھے، بھرا بھرا جسم، سُرخ و سفید رنگت، حسین خط و خال، دراز قد، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں غیر معمولی ذہانت، غرض اُن کی پُرکشش شخصیت ہر آدمی کے لئے جاذبیت رکھتی تھی وہ بہت جلد حیدر آباد کی سوسائٹی میں مقبول ہو گئے اور ادبی محفلوں میں اُن کی شخصیت کی گونج سنائی دینے لگی۔

مولوی عنایت اللہ صاحب چونکہ ناظم دارالترجمہ تھے اس لئے ان کے گھر جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کے علاوہ شہر کی تقریباً تمام بڑی شخصیتیں آتی جاتی رہتی تھیں اور اسی لئے مجھے ان بزرگوں کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔

حیدر آباد شہر کی فضا علمی اور ادبی فضا تھی۔ ایک طرف مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد کی درباری محفلیں تھیں۔ دوسری طرف ضامن کنتوری اور باغ بدایونی کے ماہانہ مشاعرے۔ اس کے علاوہ خود جامعہ عثمانیہ کے ادبی ہنگامے تھے۔ جامعہ میں عبدالقیوم باقی، اکبر وفا قانی، جی۔ ایم خاں، بدر شکیب، بدرالدین بدر، محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی اور نوعمروں میں مخدوم محی الدین، میکش حیدر آبادی، سکندر علی وجد، شعیب حزیں، زیبا ردولوی اور صمد ساز وغیرہ تھے۔

مہاراجہ کی محفلوں میں ابر بدایونی، حیرت بدایونی، ثاقب بدایونی، بیگم لکھنوی، یاس یگانہ، غبار لکھنوی، اجلال لکھنوی، ماہر القادری اور دوسرے مقامی شعرا شریک ہوتے۔ جوش ۱۹۲۹ء میں اور فانی بدایونی ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد پہنچے۔ یہ لوگ بھی ان محفلوں میں باقاعدہ شریک ہونے لگے۔

فانی ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد آئے۔ ان کے مکان پر بھی روزانہ شام کو ادبی جگھٹا ہونے

لگا۔ ان محفلوں میں جوشؔ، یگانہؔ، آزادؔ انصاری، حیرتؔ بدایونی، ماہرؔ القادری، نثارؔ یار جنگ، نواب تراب یار جنگ سعیدؔ، علی اختر، صدقؔ جائسی، ہوشؔ بلگرامی وغیرہ شریک ہوتے۔ انہی محفلوں میں غالبؔ کے بام شہرت پر کمندیں ڈالی گئیں، انہی محفلوں میں نظیرؔ اکبرآبادی کو عوامی شاعر کہا گیا۔ (پہلی مرتبہ) اور ان کی شاعری سے ریچھ کا بچہ برآمد کیا گیا، انہی مجلسوں میں علی اختر اور جوشؔ کی شاعری کے قد ناپے گئے اور نہ جانے کتنے ادبی مورچے لگائے گئے اور تنقید اور تنقیص کے نہ جانے کتنے نشتر توڑے گئے۔ یگانہؔ کی غالبؔ دشمنی نے یہاں بھی محاذ قائم کیا اور جوشؔ جو غزل کے دشمن تھے اور یگانہ اور کچھ دوسرے حضرات ایک طرف اور فانیؔ، آزادؔ انصاری، حیرتؔ بدایونی اور ہوشؔ بلگرامی وغیرہ دوسری طرف ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئے۔ جوشؔ نے "غزل گو شاعر سے خطاب" والی نظم فانیؔ پر کہی۔ اسی طرح یگانہؔ نے بھی کچھ رباعیاں فانیؔ کے خلاف کہیں اور فانیؔ نے بھی کچھ رباعیاں کہیں جن میں سے ایک یہ ہے

کیا خضرِ طریق کہہ کے رہزن کہتے
بنتی نہیں موم کہہ کے آہن کہتے!
ورنہ وہ دوستوں نے ایذا دی ہے
شرم آتی ہے دشمنوں کو دشمن کہتے

شہر کے ایک مشہور حکیم محمد شعیب تھے ان کے گھر بھی شام کو محفلیں منعقد ہوتیں یہاں بھی جوشؔ بڑے اہتمام اور پابندی سے شریک ہوتے۔ ان محفلوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ابوالخیر مودودی (مولانا ابوالاعلیٰ کے بڑے بھائی) مولانا اعجاز الحق قدوسی، لیفٹیننٹ اشرف الحق عریاں اور شہر کے دوسرے دانشور جمع ہوتے اور سیاست سے لے کر ادب تک شاید ہی کوئی موضوع ہوگا جو زیر بحث نہ آتا ہو۔

غرض جوشؔ کی آواز، مہاراجہ کے مشاعرے ہوں۔ شہر کی ادبی نشستیں ہوں یا جامعہ کے ادبی جلسے ہر طرف گونجنے لگی۔ دربار داری سے جوشؔ کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن جوشؔ اعظم جاہ ولی عہد نظام دکن کی شام کی محفلوں میں اکثر شریک ہوتے غالباً انہیں

دربار داری کے آداب سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا۔

جوشؔ سچے آدمی تھے اور ان کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان کے کردار کا کوئی بُرا یا بھلا پہلو ایسا نہیں تھا جو ہر آدمی پر روشن نہ ہو اور کردار کے اسی رُخ نے انہیں بعض کی نگاہوں میں نہایت محبوب بنا دیا تھا اور بعض ان کی اسی روش سے ان کے جانی دشمن تھے۔ طعن و تشنیع کا کون سا نشتر ہے جو اُن کے دل میں پیوست نہ کیا گیا ہو۔ ایذا رسانی کے تمام سیلابوں کا رُخ اُن کی طرف موڑا گیا، کُفر کے فتوے لگائے گئے۔ انہیں کافر و زندیق کہا گیا اور بعض اوقات اُن پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے حربے بھی استعمال کئے گئے۔ حیدر آباد کی ریاستی سازشوں کا بالآخر وہ بھی شکار ہوئے اور نظامِ دکن کی سالگرہ کے موقع پر شائع ہونے والی ایک بہاریہ نظم کے اس شعر کو ؎

کبھی جوشؔ کے جوش کی مدح فرما
کبھی دلبروں کی ثناخوانیاں کر

بہانہ بنا کر انہیں ریاست سے نکال دیا گیا۔

جوشؔ کی قدآور شخصیت اس معاشرے میں ایسی ہی ہے جیسے بونوں کی بستی میں گلیلیو۔ ہزار نظامِ دکن اور ہزار کفر کے فتوے لگانے والے مل کر بھی اُن کی شخصیت کو دُھندلا نہیں سکتے۔ جوشؔ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

عظیم لوگوں کو ایک نظر دیکھ لینا بھی عظمت ہے اور مجھے یہ عظمت حاصل ہے کہ میں نے بعض عظیم لوگوں کو قریب سے دیکھا ہے ان عظیم لوگوں میں جوشؔ بھی ہیں۔

ع حضرت جوشؔ کی آخری تحریر۔

میرزا یاس یگانہ

تیس چالیس سال پہلے تک شہر تو شہر قصبات میں بھی ایسی ہستیاں موجود تھیں جن سے تہذیبی و ثقافتی رہنمائی ملتی تھی۔ بڑے شہروں میں اہلِ علم وادب نہ صرف اپنی ذات میں ایک انجمن ہوتے بلکہ ہر انجمن ان کی ذات کی آئینہ دار ہوتی۔ تاریخِ ادب میں ایسی انجمنوں کے تذکرے ملتے ہیں اور ایسی ہستیوں کا ذکر آتا ہے جن کے دم قدم سے ہر انجمن رونق پذیر ہوتی۔

ہمارے ہوش میں لالہ سری رام کا دیوان خانہ، مسیح الملک حکیم اجمل خان کی صحبتیں، ناصر نذیر فراق اور حسن نظامی کی مجلسیں، پنڈت امرناتھ ساحر کی محفلیں اور آخر آخر میں یارانِ کتب خانہ علم وادب کے جمگھٹے دلی کی ادبی اور تہذیبی روایات کا سرمایہ تھے۔

حیدرآباد دکن میں بھی ایسے ٹھکانے تھے جہاں ادیب اور شعرا جمع ہوتے، ان میں سب سے بڑا مرکز مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی حویلی تھی۔ اس کے علاوہ ضامن کنتوری، باقی بدایونی کے دولت کدے اور جامعہ عثمانیہ کے بعض طلبہ کی محفلیں تھیں۔

فانی بدایونی تیسری بار ۱۹۳۲ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی دعوت پر حیدرآباد آئے۔ ناپلی ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل ڈیوڈز میں مقیم ہوئے۔ پھر صلح سرائے میں قیام پذیر ہوئے اور سرکاری ملازمت کے ساتھ جب ملے پلی میں سرکاری مکان ملا تو اس میں منتقل ہو گئے۔ مکان کے سامنے میدان تھا۔ شام کو چھڑکاؤ کر کے کرسیاں ڈال دی جاتیں اور اس طرح یہاں فانی کے دوستوں اور قدر دانوں کا مجمع لگتا، یہ محفلیں شام کے جھٹپٹے میں شروع ہوتیں اور رات بھیگنے تک جاری رہتیں۔ تقریباً روز کے آنے والوں میں حکیم آزاد انصاری، علامہ حیرت بدایونی، مترابِ یار جنگ سعید، نواب نثار یار جنگ مزاج، ہوش بلگرامی، جوش ملیح آبادی، علی اختر، یاس یگانہ (جب وہ

شہر میں ہوتے) ماہرالقادری، شاہد صدیقی، نجم آفندی، قاضی عبدالغفار اور حرماں خیرآبادی وغیرہ تھے۔ انہی محفلوں میں ادب اور ثقافت کے بہت سے مورچے لگے۔ انہی محفلوں میں معاصرانہ چشمکوں کی کوکھ سے بعض تاریخی واقعات نے جنم لیا۔ انہی محفلوں میں غالب کے بام شہرت پر کمندیں ڈالی گئیں۔ انہی مجلسوں میں نظیر اکبرآبادی کی عوامی شاعری سے ریچھ کا بچہ برآمد کیا گیا۔ انہی صحبتوں میں جوش اور علی اختر کی شاعری کے قد ناپے گئے اور انہی جمگھٹوں میں ادب پاروں کی جراحی میں نہ جانے کتنے نشتر توڑے گئے۔

فانی اپنے ہم عصروں میں آرزو لکھنوی، حسرت موہانی اور یاس یگانہ کی شاعری کے مداح تھے۔ آرزو لکھنوی سے لکھنؤ کے دورانِ قیام میں پر تپاک ملاقات تھی، حسرت اور فانی علی گڑھ کی تعلیمی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور یگانہ سے ان کی دوستی تھی۔ فانی کا یہ شعر:

وہ نامرادِ اجل بزمِ یاس میں بھی نہیں
یہاں بھی فانی آوارہ کا پتا نہ ملا!

یاس یگانہ ہی کی محفلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فانی اپنے مخصوص ترنم میں یاس کا یہ شعر:

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر کی سادگی برستی ہے

زانو پر ہاتھ مار مار کر پڑھا کرتے تھے۔

مرزا صاحب اس زمانے میں غالباً عثمان آباد میں سب رجسٹرار تھے، جب وہ بلدے میں ہوتے تو باقاعدہ ان محفلوں میں شریک ہوتے اور اپنی ذات سے جانِ محفل ثابت ہوتے۔

مرزا صاحب بڑے طنطنے کے آدمی تھے۔ علمی تمکنت کے ساتھ ساتھ نازک مزاجی بھی مرزا صاحب کا خاصّہ تھی۔ مرزا صاحب جوش اور فانی کے دوست تھے، یہ الگ بات کہ انہوں نے ان دونوں کے متعلق (مخالفانہ) رباعیاں بھی کہی ہیں۔ مگر

شاعری میں مرزا صاحب کی دوستی کسی سے نہیں تھی اور ویسے بھی اس دوستی میں سب سے بڑی رکاوٹ فانی کی غالب دوستی تھی، فانی غالب کے پرستار اور مرزا صاحب غالب کے دشمن۔

غالب سے مرزا صاحب کی نفرت کا سبب یہ تھا کہ وہ غالب کو ہرگز اس شہرت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے جو اسے حاصل تھی۔ فارسی شاعری جس پر غالب کو ناز تھا اور جس کے متعلق اس کا اپنا دعویٰ تھا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

مرزا صاحب کے نزدیک پوچ تھی اور وہ غالب کو متقدم فارسی شعرا کے کلام کا سارق سمجھتے تھے۔ غالب نے خود بھی تقریباً اُنیس شعرا کا اپنے کو متبع بتایا ہے اور وہ عرفی، صائب، نظیری، بیدل، شوکت اور علی حزین وغیرہ کے پورے کے پورے مضامین لے کر ذرا سے ردّ و بدل کے بعد اپنا کر کے پیش کرتے ہیں اور اس طرح غالب نے چوری اور سینہ زوری کا فارسی گوئی میں مظاہرہ کیا ہے۔

غالب کی اردو شاعری کے متعلق مرزا صاحب کا یقین تھا کہ غالب جس رنگِ سخن کے موجد سمجھے جاتے ہیں، ان سے پہلے یہی رنگِ سخن ناسخ نے اور ان کے بعد مومن نے ایجاد کیا اور غالب ایک طرح سے ان دونوں کے متبع ہیں۔ ویسے بھی محمد حسین آزاد کی طرح مرزا صاحب کا یہ دعویٰ تھا کہ غالب کو اردو نہیں آتی۔

فانی کی ان صحبتوں میں اکثر غالب کی شاعری زیرِ بحث آتی اور غالب کے "طرفدار" اور "سخن فہم" ان بحثوں میں شریک ہوتے، غالب کے طرفداروں میں فانی، حکیم آزاد انصاری، علامہ حیرت، ہوش بلگرامی اور نواب نثار یار جنگ وغیرہ ہوتے جبکہ سخن فہموں میں یاس یگانہ، جوش ملیح آبادی، نجم آفندی وغیرہ ہوتے، خوب خوب بحثیں ہوتیں اور ایک ایک شعر کی وہ جراحی ہوتی کہ بس!! مرزا یاس یگانہ نے غالب کے تمام اردو کلام پر اصلاح کا سلسلہ شروع کیا تھا، ممکن ہے یہ مسودات کہیں محفوظ

ہوں۔ غالبؔ کے مطلع دیوان پر مرزا صاحب کو اعتراض یہ تھا کہ "ہر پیکرِ تصویر" غلط ہے کیونکہ تصویر کا ایک ہی پیکر ہوتا ہے اور "پیکر ہر تصویر" کہنا چاہیئے تھا مرزا صاحب نے اس پر جو اصلاح دی وہ غالباً کچھ یوں تھی :

کاغذی ملبوس میں پیکر ہے ہر تصویر کا

اسی طرح غالبؔ کا یہ شعر :

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

مرزا صاحب کے نزدیک اصلاح طلب تھا اور انہیں سیلاب بلا پر اعتراض تھا، یہ درست ہے کہ اب "سیلاب" بہ معنی طوفان استعمال ہوتا ہے لیکن "سیلاب" کے معنی ہیں "سیلِ آب" پھر ویسے بھی "سیلاب بلا" میں لفظی تنافر ہے۔ مرزا صاحب کی اصلاح یہ تھی :

کس کے گھر جائے گا یہ سیلِ بلا میرے بعد

ان کا کہنا تھا کہ حرفِ اشارہ "یہ" سے شعر زیادہ پُر معنی ہو گیا ہے اور تنافر لفظی کا عیب بھی جاتا رہا۔

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال !
حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اس شعر میں مرزا صاحب کو لفظ "ہنگامہ" پر اعتراض تھا اور ان کا کہنا تھا کہ یہ لفظ اس شعر میں کوئی معنی نہیں دیتا۔ مرزا صاحب نے اصلاح اس طرح دی :

پیرایۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

مرزا صاحب نے غالب کے بعض شعروں میں ذم بھی تلاش کر لیا تھا مثلاً :

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے

یا اس شعر میں :

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی!

اگر کوئی کم علم دونوں مصرعوں کے ابتدائی الفاظ کو اعراب کی تبدیلی کے ساتھ پڑھے تو!! یہ مرزا صاحب کی سراسر زیادتی تھی لیکن غالب کے باب میں وہ ایسی زیادتیوں کو روا رکھتے تھے۔

مرزا صاحب غالب کی شاعری سے قطع نظر غالب کے ذاتی کردار پر بھی بھرپور وار کرتے اور اس کو کاسہ لیس، خوشامدی، بے غیرت اور نہ جانے کیا کیا تاریخی شواہد سے ثابت کرتے اور اس طرح اُس کی مذمت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے۔

ان صحبتوں میں بعض اوقات ادبی بحثیں ذاتیات کا رنگ اختیار کر جاتیں اور جن کے نتیجے میں بعض ادب پارے بھی تخلیق ہوئے۔ جوش کی نظم "غزل گو شاعر سے خطاب" خالصتاً فانی کے متعلق ہے۔ فانی اور یگانہ نے بھی ایک دوسرے کے متعلق رباعیاں کہی ہیں۔ مثلاً فانی کی یہ رباعی:

کیا خضرِ طریق کہہ کے رہزن کہتے بنتی نہیں موم کہہ کے آہن کہتے
ورنہ وہ دوستوں نے ایذا دی ہے شرم آتی ہے دشمن کو بھی دشمن کہتے

غرض یہ صحبتیں اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہیں۔ لیکن دل کے ساتھ ساتھ ذہن بھی آج تک انہی صحبتوں میں دھڑکتا ہے۔ ان بزرگوں کی دشمنی بھی آج کل کی دوستی سے زیادہ وقیع تھی۔ وہ لوگ صاحبِ علم تھے آج کل کے ادیب کم سواد ہیں۔ وہ لوگ اختلافِ رائے کے باوجود احترام دوستی میں خلل نہ آنے دیتے تھے۔ ہائے کیا لوگ تھے:

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ٹڈّو بھائی

شاہد بھائی، شدّو بھائی یا ٹڈّو بھائی سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ انٹرمیڈیٹ میں پڑھتے تھے۔

شاہد بھائی کے چھوٹے بھائی سراج الدین احمد میرے سگے خالو اور خالہ کی رضاعت کے رشتہ سے میرے بہنوئی ہیں۔ میں ان کے ہاں آتا جاتا تو شاہد بھائی اور ان کے بڑے بھائی منذر احمد کو اکثر دیکھنے کا اتفاق ہوتا۔ یہ سب ایک ہی مکان کے مختلف علاقوں رہتے تھے۔ اس زمانے میں شاہد بھائی کے والد بزرگوار مولوی بشیر الدین احمد زندہ تھے، اور فالج کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ مولوی بشیر الدین احمد نے اپنے تمام لڑکوں کی شادی کمسنی ہی میں کر دی تھی، چنانچہ میری خالہ کی عمر شادی کے وقت صرف پانچ سال تھی۔ شاہد بھائی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ زندگی سے ہر طرح مطمئن اور خوش تھے۔ شاہد بھائی کو اس زمانے میں گانے کا نیا نیا شوق ہوا تھا وہ ہارمونیم پر مشہور شعرا کی غزلیں گاتے اور گھر یا کنبے کی کوئی تقریب ایسی نہیں تھی جس میں شاہد بھائی کا گانا نہ ہوتا ہو۔ اسی طرح کی ایک محفل میں میری ان سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ انھیں گانے کا شوق تھا اور مجھے شاعری کا شعر و نغمہ کا یہ رشتہ نہایت مستحکم ثابت ہوا، اور پھر ملاقاتیں بے تکلفی اور دوستی میں تبدیل ہو گئیں۔

شاہد بھائی جس مکان میں رہتے تھے اُسی سے ملا ہوا ایک اور مکان تھا جو مردانہ کہلاتا تھا۔ نچلے حصے میں شاہد بھائی کے رشتے کے ایک ماموں اشتیاق صاحب بیٹھا کرتے تھے۔ اشتیاق صاحب مولوی بشیر الدین احمد کے مینجر تھے اور جائداد اور کتابوں کے تمام کام کی نگرانی انھی کے ذمہ تھی۔ وہ نہایت خوش رو اور خوش پوش تھے اور اپنی ذہانت کی وجہ سے بڑے سے بڑا سرکاری افسر ان کا دوست تھا۔ جاڑوں میں روز نہاری کی دعوتیں ہوتیں اور ان میں سر ظفر اللہ اور سر عبدالرحیم بھی شریک ہوتے۔

اشتیاق صاحب کے چشم و ابرو کے اشارے سے بڑے بڑے کام آناً فاناً میں ہو جاتے۔ اوپر کے ایک حصّہ میں شاہد بھائی کی بیٹھک رہتی۔ یہاں گانے کی محفلیں سجتیں، بے تکلّف احباب کے مجمعے ہوتے ڈنڈ پیلے جاتے، دعوتیں ہوتیں، غرض زیادہ وقت ہو حق میں گذرتا۔

اسی طرح کی ایک محفل میں احباب کو خیال آیا کہ ایک رسالہ نکالا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہد بھائی بی۔اے (آنرز) ہو چکے تھے اور ریلوے کی کسی ملازمت کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ کسی نے رائے دی کہ دیوان حافظ سے فال لی جائے۔ چنانچہ دیوان حافظ منگایا گیا اور فال میں رسالے کا نام 'ساقی' کھلا۔ بس پھر کیا تھا فوراً لکھنے والوں کی فہرست بنائی گئی۔ تمام دوستوں کے نام لکھے گئے حالانکہ ان میں سے بہتوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی مضمون نہ لکھا تھا۔ اس کے بعد شہر میں جو ادبی شخصیتیں تھیں ان کے نام لکھے گئے اور پھر ملک کی نامور ہستیوں کا نمبر آیا طے پایا کہ ساقی بنیادی طور پر دِلّی کی زبان اور ثقافت کا نقیب ہوگا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۰ء کا ہے۔ شاہد بھائی کے احباب لکھنے والوں کے علاوہ اُس وقت دِلّی میں میر ناصر علی صلائے عام کے مدیر اور مالک، خواجہ حسن نظامی، ناصر نذیر فراق، قاری سرفراز حسین مصنّف شاہدِ رعنا، راشد الخیری، مرزا محمد سعید دہلوی، مُلّا واحدی اور شاعروں میں پنڈت امرناتھ ساحر، آغا شاعر قزلباش، بے خود دہلوی، سائل دہلوی، پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار اور مہاراج بہادر برق موجود تھے۔ اُدھر حیدرآباد میں دِلّی کی بعض نامور شخصیتیں تھیں، ان میں مولوی عنایت اللہ ناظم دارالترجمہ، مرزا فرحت اللہ بیگ اور غلام یزدانی (فرحت اللہ بیگ کی زبان میں دانی میاں) اور نوجوانوں میں سیّد وزیر حسن اور آغا حیدر حسن تھے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ شاہد و ساقی نے ان سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور ان سب کے مضامین ساقی میں چھپے۔ سیّد وزیر حسن شاہد بھائی کے برادر نسبتی ہیں مگر یہ رشتہ پہلی بیوی کے تعلق سے ہے۔

'ساقی' جب نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس زمانے میں پنجاب سے نیرنگِ خیال، ادبی دنیا اور دوسرے رسالے بڑی آب و تاب سے شائع ہو رہے تھے۔ اِسی

زمانے میں سید امتیاز علی تاج کا ڈرامہ انار کلی شائع ہوا تھا اور پنجاب کے رسالوں میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ ساقی نے بھی اس ڈرامے پر تنقید کر ڈالی۔ بس پھر کیا تھا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور دلّی اور ساقی کی زبان اور ثقافت پر چوٹیں ہونے لگیں، اور لکھنے والوں نے اپنا نام "نیاز مندانِ لاہور" رکھا۔

اِدھر سے جواباً "شلوارانِ ادب کے نام" کے عنوان سے مضامین کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ "نیاز مندانِ لاہور" میں چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، احمد شاہ پطرس بخاری، کرنل مجید ملک، سیّد امتیاز علی تاج اور ڈاکٹر تاثیر وغیرہ تھے۔ اور ادھر نو مشق لکھنے والے سیّد انصار ناصری، فضل حق قریشی، ممتاز حسین، سیّد وزیر حسن اور علاّمہ مضحک ان سب میں علاّمہ مضحک بڑے تھے۔

غرض یہ معرکہ نہایت دلچسپ تھا اور لوگ ساقی کا ہر مہینہ بڑی بے تابی سے انتظار کرتے تھے، ساقی کی شہرت میں ان مضامین کا بھی خاصا دخل رہا ہے۔ ساقی ہر ماہ آب و تاب سے شائع ہوتا رہا اور پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے نام بھی اس کے ذریعے شہرت پاتے رہے۔

ساقی نے بہت سے لکھنے والے پیدا کئے اور انہیں شہرت دی۔ ان میں عظیم بیگ چغتائی، عصمت چغتائی، اختر حسین رائے پوری وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

میرے نانا مولوی عنایت اللہ دہلوی ریاست حیدر آباد میں ناظم دارالترجمہ تھے۔ میں اُن کے پاس چلا گیا اور اب شاہد بھائی سے ملاقاتوں کا مزہ خط و کتابت میں آنے لگا۔ میں تقریباً ہر سال دلی آتا اور ان سے اپنے قیام کے زمانے میں کئی کئی گھنٹے ملاقات رہتی۔

شاہد بھائی کے منجھلے بھائی مبشر احمد حیدر آباد میں پولیس انسپکٹر تھے اور ان کے ایک پھوپھی زاد بھائی لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر اشرف الحق بھی حیدر آباد میں تھے، شاہد بھائی دو تین سال میں ایک پھیرا حیدر آباد کا ضرور کرتے اور دلّی کی محفلیں اس طرح حیدر آباد میں جمنے لگتیں۔

کردار کے لحاظ سے شاہد بھائی کے یہ دونوں بھائی عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے۔ بشارت احمد حیدرآباد کے بڑے نامور پولیس انسپکٹر سمجھے جاتے تھے۔ ایک پیسہ رشوت نہیں لیتے تھے اور اپنے کام میں کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ انھوں نے نظام دکن کی موٹر کا چالان کر دیا اور عدالت سے ڈرائیور پر جرمانہ کرا کے چھوڑا۔ نظام کی سواری روز شام کو جس راستے سے گذرتی اس کے ایک تھانے پر وہ تعینات تھے۔ وہ ہر روز نظام کو سواری گذرتے وقت سلام کرتے۔ اُن کے افسروں نے ان کا وہاں سے تبادلہ کر دیا۔ اب جو نظام گذرے تو اُن کو موجود نہ پا کر موٹر روک لی اور اُن کی غیر موجودگی کا سبب پوچھا۔

افسروں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو ایک گھنٹے کے اندر اندر ان کا تبادلہ پھر اسی جگہ کر دیا گیا۔ نظام کی سواری واپس آئی تو انہیں ڈیوٹی پر موجود پا کر نظام خوش ہوئے۔

شاہد بھائی کے پھوپھی زاد بھائی لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر اشرف الحق شاید برِصغیر کی عجیب وغریب شخصیت تھے، وہ بچوں میں بچے جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے، کوئی کام ایسا نہیں تھا جو وہ نہ جانتے ہوں، ڈاکٹری سے لے کر نگینہ سازی تک انہیں آتی تھی۔ ہر فن مولا تھے، ان کی ڈاکٹری اعادۂ شباب کی سرجری کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتی تھی، وہ مشہور جرمن ڈاکٹر وارنوف اور اشتائیناخ کے شاگرد تھے۔ اس پر ان کی ہزل گوئی سونے پر سہاگہ، وہ عریاں تخلص کرتے تھے ان کا مزاج اختراع اور تحقیق کی طرف بہت مائل تھا۔ وہ زندگی کے علاوہ ڈاکٹری کے بھی عجیب عجیب تجربے کرتے رہتے تھے۔ کبھی کڑک مرغی سے انڈا دلوا لیا۔ کبھی کسی دوا میں کوئی اور دوا ملا کر کوئی نئی چیز بنا لی۔ الغرض وہ زندگی کے تقریباً تمام تجربات سے گذرے تھے۔ ان تجربات میں سب سے زیادہ تجربے انہوں نے عورت اور منشیات پر کئے تھے۔ افیون، چانڈو، مدک، چرس، بھنگ، فلک سیر، کوکین غرض کوئی نشہ ایسا نہیں تھا جو انہوں نے نہ کیا ہو، شراب تو ان کے خون کی طرح سارے جسم میں دوڑتی رہتی تھی۔ کسی زمانے میں باقاعدہ ساقی نوکر تھا اور عورت کے ذریعے وہ "بین الملل" میل جول کے قائل تھے اور پینتیس چھتیس

سال یورپ میں یہی کام کرتے رہے تھے۔ انہوں نے ان تمام تجربات کو جو عورت اور نشوں سے متعلق تھے باقاعدہ لکھا تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری، جو ایک طرح سے خفیہ لائبریری تھی، دیکھنے کی چیز تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ نہایت خدا ترس، دیانتدار، ہمدرد اور نیکو باطن تھے۔ ضرورت مندوں کے کام آنے والے اور نہایت غمگسار آدمی تھے۔ نشہ میں انہیں کبھی بدمست یا آپے سے باہر نہیں دیکھا گیا۔ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اپنا کلام مجھ سے ٹھیک کراتے اور اس کا معاوضہ میری انتہائی خاطر مدارات سے دیتے اور تقریباً ہر روز میرے پاس آتے۔ حالانکہ وہ میرے والد کے برابر تھے اور میں اُن کی اس پذیرائی سے نہایت شرمندہ ہوتا۔

وہ ڈپٹی نذیر احمد کے نواسے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد میں سے تھے۔ ان میں خاندانی نجابت کے عجیب عجیب جوہر تھے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب دلّی آئے ہوئے تھے۔ کتب خانۂ علم و ادب میں جہاں شام کو یاروں کی بھیڑ جمتی تھی۔ احباب جمع تھے، ڈاکٹر صاحب بھی تھے کہ تھوڑی دیر بعد ان کا لڑکا آیا اور اس نے اپنی چھوٹی بہن کے مرنے کی اطلاع ڈاکٹر صاحب کو دی۔ ڈاکٹر صاحب اس بات پر نہایت خفا ہوئے اور لڑکے سے مخاطب ہو کر بولے کہ لڑکی میری مری ہے ان سب لوگوں کو تم نے کیوں بے مزہ کیا اور جب تک محفل برخاست نہیں ہوئی وہ وہیں بیٹھے رہے اور ہم سب سے اپنے لڑکے کی بدتمیزی کی معافی چاہتے رہے۔ ایسے لوگ اب کہاں سے

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں
وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

غرض شاہد بھائی جب حیدر آباد آتے تو ایسے ہی لوگوں میں رہ کر چوبیس گھنٹے ہنستے بولتے گذرتے۔ اُس زمانے میں حیدر آباد مرجعِ خلائق تھا۔ سارے برِصغیر کی نامور شخصیتیں یہاں جمع تھیں۔ ان میں نظم طباطبائی، مرزا ہادی رُسوا، فانی بدایونی، مولانا عبداللہ عمادی، مولوی مسعود علی محوی، عنایت اللہ دہلوی، مرزا فرحت اللہ بیگ، غلام یزدانی، یاس یگانہ، جوش ملیح آبادی اور نوجوانوں میں ناکارہ حیدر آبادی، سید وزیر حسن، آغا حیدر حسن، بادہ شاہ

حسین اور عبد القیوم باقی قابلِ ذکر ہیں۔ شاہد بھائی ان میں سے بہتوں سے واقف تھے، بعض سے صرف خط و کتابت تھی اور بعض سے انھیں میں نے ملا دیا تھا۔ فانی بدایونی سے اور مولوی عنایت اللہ دہلوی سے میں نے انھیں ملایا۔ فانی نے چند غزلیں اور مولوی عنایت اللہ نے "نجم السحر" ناول کا مسودہ انھیں دیا۔

۱۹۴۰ء میں میں مستقل طور پر دلی آگیا اور اب روزانہ کتب خانہ "علم و ادب" میں ان سے شام کو ملاقات رہنے لگی۔ یہ کتب خانہ بھی عجیب جگہ تھی۔ ہندوستان کی شاید ہی کوئی ادبی شخصیت ہوگی جو یہاں نہ آئی ہو۔ ان میں جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان بھی شامل ہیں۔ روز کے آنے والوں میں انصار ناصری، فضل حق قریشی، ممتاز حسین، ظفر قریشی، نہال سیوہاردی، صادق الخیری، صلاح الدین، محمد مرزا، اخلاق احمد دہلوی اور میں تھا۔ کبھی کبھار ن۔ م۔ راشد، کرشن چندر، مولانا حامد علی خان، میرا جی، سعادت حسن منٹو اور اپندر ناتھ اشک بھی آنکلتے۔

غرض ان صحبتوں میں زندگی کا ہر مسئلہ زیر بحث آتا اور نتیجہ ہمیشہ کسی لطیفے کی صورت میں نکلتا اور اس طرح زندگی کے دن ہنسی خوشی تیر ہوتے رہے، یہ ساری رونق شاہد بھائی کے دم سے تھی۔

تقسیم ملک کے بعد شاہد بھائی خاندان سمیت نہایت پریشان حالات میں دلی سے کراچی آگئے۔ ساقی ان کے دم کے ساتھ تھا۔ شروع شروع میں وہ مارٹن روڈ کے ایک کوارٹر میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ رہے پھر جب پیر الٰہی بخش کالونی میں ان کا مکان بن گیا تو وہ اس میں منتقل ہو گئے اور مرتے دم تک وہیں رہے۔ اس عرصے میں شاہد بھائی کو زندہ رہنے کے لیے بڑی جد و جہد کرنی پڑی اور انھوں نے نہایت عبرت کے ساتھ تماشائے اہلِ کرم دیکھا لیکن خود کبھی فقیروں کا بھیس نہیں بنایا۔ ریڈیو کی ملازمت کرنی پڑی اور بہت سے چھوٹوں کو بڑا ماننا پڑا۔ ساقی چند مہینوں کے ناغہ کے سوا برابر جاری رہا اور مرتے دم تک جاری رہا۔ ان حالات میں بھی شاہد بھائی نے اپنی کسی وضع میں فرق نہیں آنے دیا۔ گھر کا وہی اُجلا خرچ۔ وہی آئے گئے کی مدارات، وہی دعوتیں اور وہی مزاج میں شگفتگی اور بے نیازی۔

مگر وہ اندر ہی اندر گھلے جا رہے تھے وہ اپنا غم دوسروں پر کبھی ظاہر نہیں کرتے تھے، وہ اپنی لاش کے تنہا مزدور تھے۔ اسی عالم میں ان پر بعض صدمے شدید گذرے اور آخر میں ان کی اپنی بیماری اور جوان بیٹی کی موت نے انہیں بٹھا دیا اور ایسا بٹھایا کہ پھر نہ اُٹھے۔

شاہد بھائی ایک خاص مزاج کے آدمی تھے، وہ بظاہر کم آمیز تھے مگر بباطن سراپا محبت اور خلوص، ہر شخص سے ایک فاصلہ قائم کر کے ملتے۔ نہ کسی کی حدوں میں داخل ہوتے اور نہ کسی کو اپنی حدوں میں آنے دیتے، لیکن چند لوگوں سے وہ نہایت بے تکلف اور کُھل کر ملتے تھے۔ مزاج کی اسی کیفیت کی وجہ سے انہیں کچھ لوگ مغرور سمجھتے تھے۔ حالانکہ ان کے مزاج میں بلا کی فروتنی تھی۔ ان کا لباس ہمیشہ سے ایک خاص نہج کا ہوتا شفاف بیلدار کرتا اور لٹھے کا پاجامہ، اس پر شیروانی اور ٹوپی اور پاؤں میں معمولی سا پمپ۔ وہ ہمیشہ سے بیڑی پیتے تھے اور جب بیڑی نہ ملتی تو سستا سگریٹ پسند کرتے۔ بڑے آدمیوں سے انہوں نے کبھی دوستی نہیں رکھی حالانکہ بہت سے بڑے آدمی ان کے ہم سبق اور کسی نہ کسی طرح ان کے ممنونِ احسان تھے، وہ غریبوں سے مل کر زیادہ خوش ہوتے اور انہی سے میل جول رکھتے۔

فروتنی کے ساتھ ساتھ ان میں خودداری بلا کی تھی۔ بعض وقت اس خودداری کا مظاہرہ عجیب طرح ہوتا۔

ایک دفعہ نیاز فتح پوری دلی آئے اور انہوں نے ادارۂ ساقی میں آنے کی خواہش ظاہر کی۔ شاہد بھائی نے چائے کا شاندار بندوبست کیا اور اپنے احباب کو بھی مدعو کر لیا۔ نیاز صاحب وقتِ مقررّہ سے تین چار گھنٹے بعد آئے۔ بھائی شاہد نے اپنے احباب کو چائے پلا دی اور اُن کی کوئی تواضع نہیں کی۔

شاہد بھائی مر گئے مگر میرا تاثر بڑا عجیب ہے۔ مجھے ان کے مرنے کا یقین نہیں آتا اور ان کو یاد کرتا ہوں تو سوائے ان کے کوئی اور یاد حافظے میں نہیں اُبھرتی؎

اللہ رے تری یاد کہ کچھ یاد نہیں ہے!

میراجی میرے دوست

سنہ ۴۳ء کا ذکر ہے ایک دن آل انڈیا ریڈیو دلی کے براڈکاسٹنگ ہاؤس پہنچا تو ن۔ م۔ راشد کے کمرے میں میراجی کو بیٹھے دیکھا میراجی درمیانے قد کے آدمی تھے، اکہرا بدن، کتابی چہرہ، تیکھے خدوخال، سیدھی چوڑی پیشانی، گندمی رنگ، چوڑا سینہ، اُبھرواں ستواں ناک، چمکدار گہری آنکھیں، پتلے اور پیوست ہونٹ، دانت خوبصورت اور مضبوط، ہاتھ لمبے اور چوڑے شانوں تک بال، مگر ہیئت کذائی یہ کہ ایک ہاتھ میں لوہے کے گولے، دوسرے میں کاغذوں کا پلندہ گرمیوں میں جسم پر موٹا بدرنگا گرم کوٹ، ٹانگوں میں میلی گرم پتلون اور پاؤں میں بھدّے انگریزی جوتے۔

راشد نے مجھے اُن سے ملایا، نام تو پہلے ہی سُنا تھا۔ ہیئت کذائی اور خط و خال دیکھ کر دلچسپی بڑھی اور دس پندرہ منٹ میں یوں محسوس ہوا کہ برسوں کی دوستی ہے، میراجی اپنی محبّت اور نفرت میں بڑے کھرے تھے وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنی دوستی اور نفرت کا اظہار نہایت بونگے طریقے سے کر دیتے تھے۔ بولے آپ چائے پئیں گے"، میں نے کہا پی لوں گا۔ راشد ان کے لئے چائے منگا دو صرف ان کے لیے میری چائے میرے پاس ہے اور یہ کہہ کر انھوں نے ایک اٹیچی سے شراب کی بوتل نکالی اور منہ لگا کر دو گھونٹ انڈیل گئے۔ بوتل جگہ پر رکھ دی اور اپنی کسی تازہ نظم پر راشد سے گفتگو کرنے لگے راشد ان کی نئی نظم کے کوئی پرانے معنی ان کے ذہن نشین کرا رہے تھے جن کے قبول کرنے سے وہ منکر تھے اس دوران میں چائے آگئی اور چائے پی کر ہم دونوں جدا ہو گئے اور یہ تھی میراجی سے میری پہلی ملاقات، اس کے بعد تقریباً ہر روز میراجی سے ملاقات ہوئی وہ روز بروز زیادہ بے تکلف اور قریب ہوتے گئے۔

رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ میراجی غیر معمولی صلاحیتوں کے آدمی ہیں وہ اچھے ادیب، اچھے شاعر ہونے کے علاوہ اچھے مطالعے کے آدمی ہیں۔ اس زمانے میں یہی کام مشکل ہے، ان کی نظر اردو ادب کے ساتھ ساتھ سنسکرت ہندی اور انگریزی ادب پر بھی تھی، وہ ادبی بحثوں میں کبھی رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ پہلے معقولات سے بحث کرتے اور اگر دوسرا آدمی دو چار کتابوں کا نام لے کر انہیں مرعوب کرنے کی کوشش کرتا تو وہ ایسے کتابوں کے حوالے دیتے کہ جواب مُسکت ہوتا۔

رفتہ رفتہ یہ ملاقاتیں دوستی میں تبدیل ہو گئیں، میراجی، ن۔م راشد، اخلاق احمد دہلوی، انصار ناصری، مختار صدیقی، خلیل الرحمٰن اور میں دفتر کے بعد بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہتے۔ کبھی کبھی وہ کتب خانہ علم و ادب بھی آجاتے جہاں شاہد احمد اور ان کے احباب بھر ط جمائے ہوتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے میں ادب سے لے کر فحاشی تک سینکڑوں مرحلے اور لطیفے بلا ناغہ گذرتے میراجی اپنے حُلیے کے ساتھ ساتھ مزاج کے بھی بڑے اُول جلول آدمی تھے، کبھی تین تین فاقے ہیں اور کبھی پانچ پانچ روپیہ کی آئس کریم اکیلے کھا جاتے کبھی چھ چھ ہفتے نہیں نہاتے اور کبھی دن میں دو، دو دفعہ نہاتے، شاعری ان کی فطرت میں رسی بسی تھی وہ احساس حُسن کی شدت کو شاعری کا نام دیتے، خوبصورت چہرہ۔ اچھی بات، دلکش نغمہ دلفریب منظر ان کے نزدیک سب شعر تھے، کوئی اچھا چہرہ دیکھا اور انہوں نے نعرہ لگایا "شعر ہو گیا" پوچھنے والوں نے پوچھا کہاں انہوں نے اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو" کوئی پُر لطف بات سنی اور انہوں نے کہا شعر ہو گیا، اچھا نغمہ سُن کر وہ زار و قطار روتے، خوبصورت چہرے ان کی تکلیف میں اضافہ کا سبب ہوتے اچھا منظر انہیں غمگین کر دیتا۔ غرض احساس کی یہ شدتیں ان کے لئے سوہانِ روح تھیں۔ انہوں نے ان سے فرار کی بہت سی راہیں نکال لی تھیں۔ وہ شراب زیادہ پینے لگے تھے ہر وقت نئی نئی اور عجیب باتیں کر کے وہ اپنا دل بہلاتے اور توجہ بٹاتے مگر ان سب باتوں میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی تھی، وہ سچے آدمی تھے اور اسی سچائی کو وہ ہر جگہ دیکھنا

چاہتے تھے یہ ان کی زیادتی تھی۔ دنیا اور دنیا کے تعلقات میں، فطرت میں، ذہن و فکر میں اور ان کے خدوخال میں غرض اپنے اردگرد کی ہر چیز کو وہ اپنے ذہن کی مطابقت سے دیکھنا پسند کرتے۔

فرار کی یہ راہیں اکثر انہیں مہنگی پڑتیں وہ اکثر لوگوں کی خشونت کا شکار ہوجاتے بعض اوقات وہ غم خریدتے اور اس غم کی قیمت صرف ذہنی صعوبتوں کی صورت ہی میں نہیں۔ روپیوں کی شکل میں بھی ادا کرنی پڑتی جس کا نتیجہ ان کی مالی مشکلوں میں رونما ہوتا وہ ہر بے تکلف دوست ہی سے نہیں غیروں سے بھی سوال کر بیٹھتے مگر حقیر ہو کر نہیں اپنا حق جتا کر، وہ دوسروں کے مال کو اپنا اور اپنے مال کو دوسروں کا مال سمجھتے، اور اس طرح وہ اپنی ذہنی اور دلی سوگواریوں میں خوش رہنے کی کوشش کرتے۔

وہ نسوانی حسن سے بہت متاثر ہوتے اور یہ تاثر بعض وقت یہاں تک ان پر جادو کرتا کہ وہ دیواروں سے اپنا سر پھوڑتے اور لہولہان ہوجاتے۔ ایک صاحبہ جن کے نام کا ایک جزو اختر تھا ان کو بہت دردناک عذاب میں مبتلا رکھتیں۔ یہ صاحبہ مجھ سے زیادہ مانوس تھیں اس لئے میراجی مجھے ہمیشہ "تابش اختر" کہتے اور جب کوئی اپنی کتاب مجھے دیتے تو اس پر اسی طرح کی عبارت لکھتے۔

مجھ پر ان کی عجیب عجیب طرح کی مہربانیاں تھیں ایک دفعہ ایک صاحبہ نے مجھے اصرار کرکے سینما کا ٹکٹ دیا اور کہا کہ میں "جولیس سیزر اور قلوپطرا" فلم دیکھ آؤں، میں نے یہ ٹکٹ لے لیا اس روز بدھ تھا، میراجی نے یہ واقعہ دیکھ لیا، اس کے بعد میراجی ہر بدھ کو مجھے کسی جواں عورت سے سینما کے ٹکٹ کے پیسے لاکر دیتے شرط جوان عورت کی تھی اور یہ سلسلہ کوئی ایک سال تک جاری رہا، ان جوان عورتوں سے ان کے پیسے مانگنے کی ادا بھی عجیب ہوتی۔ کبھی وہ کہتے آپ کسی بھوکے کو ایک وقت کا کھانا کھلائیں گی، کبھی شراب کا واسطہ دے کر، کبھی کوئی شرط باندھ کر، یا لطیفہ سُنا کر وہ پیسے اینٹھتے اور مجھے لاکر دے دیتے۔

ان کے مزاج کی ناہمواریاں بڑی دلچسپ ہوتیں وہ دِلّی کے ایک محلے قطب روڈ

کے آس پاس رہتے تھے ایک دفعہ رات کے دو بجے میرے گھر پہنچے جو دریا گنج میں ان کے گھر سے کوئی سات آٹھ میل تھا۔ مجھے سوتے سے اُٹھایا میں نے کہا خیریت؟ بولے۔ پان کھانے کو جی چاہ رہا تھا میں نے کہا کہ تابش کے گھر چل کے کھایا جائے بس سیدھا چلا آرہا ہوں۔

وہ ریڈیو کے افسروں سے بہت ناخوش رہتے اور جتنا بڑا افسر ہوتا اُس سے ان کی ناخوشی بھی اتنی زیادہ ہوتی ایک دفعہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل اے ایس بخاری نے۔ E. M. FOSTER کو جو دلّی آئے ہوئے تھے دعوت دی اور انہیں ایک مشاعرے کا نمونہ دکھانے کا منصوبہ بنایا۔ شاعروں میں چراغ حسن حسرت ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض، ن۔م راشد، مولانا حامد علی خان، میراجی، مختار صدیقی، خلیل الرحمن، ضیا جالندھری اور میں بھی شریک تھے۔ ہمارے علاوہ اور بھی ادیب تھے کھانے کے بعد شاعری کا دور شروع ہوا اور اس کھانے اور مشاعرے کے درمیان میراجی نے جو جو باتیں کیں اور جو جو لطیفے ان سے سرزد ہوئے ان کا بیان مشکل ہے وہ نہایت برافروختہ تھے وہ ہمیں لوگوں کے اصرار سے وہاں گئے تھے اور اگر ہم لوگ انہیں گھونٹ گھونٹ کر نہ رکھتے تو نہ معلوم کیا حشر ہوتا اور دوسرے دن نہ جانے کتنوں کی نوکری جاتی۔

ان کے ذہن کی صوبت عجیب عجیب روپ دھارتی تھی۔ ایک دفعہ قاری زاہر قاسمی کو ایک کمرے میں بند کر کے انہوں نے سورۂ رحمٰن سُنی اور پھر روتے روتے اور سر پھوڑتے پھوڑتے ان کا جو حال ہوا اس کا اندازہ ان خراشوں اور چوٹوں سے کیا جاسکتا تھا جو چھ سات دن تک ان کے سر میں اور چہرے پر رہیں۔ یہی حال جے جے ونتی راگ سنکر ہوتا۔ وہ جے جے ونتی سے اس طرح گھبراتے جیسے گلے گھٹتا ہے۔

حلقہ اربابِ ذوق کا دوسرا نام میراجی ہے، قیوم نظر دلّی آئے اور حلقے کی شاخ قائم کی، میں سیکریٹری مقرر ہوا ایک کالج میں اس کے باقاعدہ اجلاس ہونے لگے اور حلقہ کی بدولت بزرگوں اور نوجوانوں میں ادبی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ بزرگوں میں چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر تاثیر، مولانا حامد علی خان، حمید احمد خان، موجودہ وائس چانسلر پنجاب

یونیورسٹی تھے اور نوجوانوں میں ہم سب ہی تھے، میراجی بڑی سرگرمی سے پروگرام بناتے اور لوگوں کو ایک اتوار ہی سے دوسرے اتوار کی یاد دہانی کراتے پھرتے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ قیوم نظر، یوسف ظفر یا کوئی اور ادیب دلّی جاتا تو حلقے کی گہما گہمی اور بڑھ جاتی۔ میراجی چائے پانی کا انتظام کرتے اور پیسے مہمانوں سے دلواتے الطاف گوہر سے بھی وہیں ملاقات ہوئی تھی۔

میراجی اپنی جگہ ایک انجمن میں ہزار انجمن تھے ان کی رنگارنگ طبیعت اس دنیا کو کب سازگار آسکتی تھی وہ ان بدنصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں دنیا نے کبھی نہیں سمجھا وہ شعور اور احساس کا جہنم تھے چند آنسو اس جہنم کو کیسے ٹھنڈا کر سکتے تھے ان کی بالیدہ روح دنیا کے فشار میں گھٹتی رہی ان کا ذہن خیالات کا سمندر تھا مگر طوفانی، ان کی زندگی کی ناؤ اسی طوفانی سمندر کے ہچکولوں میں پرخچے پرخچے ہو گئی ان کی ایک نظم "سمندر کا بلاوا" بھی تو ہے وہ دلّی سے بمبئی اور بمبئی سے اللہ میاں کے یہاں چلے گئے اب ان کے احباب ہیں اور ان کی یادوں کی مجاوری ؎

خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

E.M. FOSTER مشہور مصنف جس کی کتاب PASSAGE TO INDIA مشہور ہے۔

ماہر القادری

مولانا ماہر القادری اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور ہر انجمن میں ایک ذات تھے۔

وہ بیک وقت ادیب، شاعر، بذلہ سنج، محقق، مولوی دوست غرض سب کچھ تھے۔ ان کی شخصیت ہر خاص و عام کے لئے نہایت پُرکشش اور دلچسپ تھی۔ ان کے پاس بیٹھ کر آدمی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا ان کی ذات نہایت پہلودار تھی اور وہ جس انجمن میں ہوتے، ان کی ذات مرکزِ انجمن ہوتی بلکہ یوں کہیئے کہ ساری انجمن ان کی ذات میں سمٹ آتی۔

۱۹۲۹ء میں یعنی آج سے تقریباً پچاس سال پہلے میری ان کی ملاقات حیدر آباد دکن میں مولانا عبدالقدیر بدایونی کے یہاں ہوئی۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی اس زمانے میں عارضی طور پر حیدر آباد دکن آئے ہوئے تھے اور ماہر صاحب بھی ان کے ہمراہ حیدر آباد آئے تھے اور کسی ملازمت کی تلاش میں تھے۔ اس زمانے میں حیدر آباد میں بہت سے مشاہیر جمع تھے جن میں مولانا عبداللہ عمادی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عنایت اللہ (فرزند شمس العلماء منشی ذکاء اللہ) جوشؔ ملیح آبادی، علامہ حیرتؔ بدایونی، نظمؔ طباطبائی، ہوشؔ بلگرامی، مرزا ہادی رسوا، حکیم آزاد انصاری، مسعود علی محوی، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ماہر صاحب شروع شروع نظامت ٹپہ (ڈاکخانہ) میں نوکر ہوئے جس کے ناظم سردار نواز جنگ تھے اور جو مولانا عبدالقدیر بدایونی کے مرید تھے اور یہ ملازمت غالباً مولانا عبدالقدیر بدایونی ہی کی وساطت سے انہیں ملی تھی۔ پھر ماہر صاحب عدالتِ عالیہ (ہائیکورٹ) میں ملازم ہو گئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار تک بھی ماہر صاحب کی رسائی مولانا عبدالقدیر ہی کے ذریعے ہوئی۔

یہ زمانہ حیدر آباد کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اہلِ علم اور اہلِ ادب کی بہتات

سے ہر جگہ علم وادب کے چرچے رہتے، مہاراجہ بہادر کے یہاں کی ادبی محفلوں کے علاوہ شہر میں باغ بدایونی اور رضا حسن کنتوری کے ماہانہ مشاعرے اور عثمانیہ یونیورسٹی کی ادبی محفلیں اور اہلِ علم اور اہلِ ادب سے رونق پاتیں، پھر فانی بدایونی بھی ۱۹۳۲ء تک حیدرآباد آگئے تھے۔ ان کے یہاں اور جوشؔ ملیح آبادی کے یہاں بھی شعرا اور اہلِ ذوق جمع رہتے اور شعروسخن کی خوب داد پاتے۔ یہ زمانہ ماہرؔ صاحب کے اپنے شباب اور شبابِ شعر کا زمانہ تھا۔ دوستوں اور احباب کی محفلیں ان کے علاوہ ہیں۔

ماہرؔ صاحب یوپی کے ایک متوسط زمیندار گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے والد بلکہ پورا خاندان نہایت راسخ العقیدہ مسلمان خاندان تھا اور ماہرؔ صاحب کی تربیت میں مذہبی تعلیمات کا ایسا رچاؤ شروع ہی سے رہا کہ آخر تک ان کے مزاج میں اسلام کی سچی لگن اور عشقِ رسول قائم رہا۔ میں نے حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں بھی انہیں ہمیشہ ایک پکا مسلمان پایا حالانکہ جوانی میں عام طور پر لوگ اس ڈگر سے بھٹک جاتے ہیں، ماہرؔ صاحب کی اسلام سے یہی سچی لگن تھی جس نے ان کو نواب بہادر یار جنگ سے بہت قریب کر دیا تھا۔ اتحاد المسلمین کا شاذ ہی کوئی جلسہ ایسا ہوتا ہو جس میں نواب بہادر یار جنگ کی تقریر کے ساتھ ساتھ ماہرؔ القادری کی نظم نہ ہوتی ہو۔

حیدرآباد میں ماہرؔ صاحب کے عقیدت مندوں میں بلکہ محبت کرنے والوں میں نواب دوست محمد خاں اور نواب نثار یار جنگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں حضرات کو عمدہ کھانے کا بڑا ذوق تھا اور عمدہ کھانا، ماہرؔ صاحب کی کمزوری، ماہرؔ صاحب کو عمدہ کھانے کے شوق نے کھانے کا بھی ماہرؔ بنا دیا تھا، انہیں معلوم تھا کہ کچی بریانی حیدرآباد کے کس ہوٹل کی عمدہ ہوتی ہے، ڈبل کا میٹھا کہاں اچھا ملتا ہے، آغا کے ہوٹل کے پائے سب ہوٹلوں سے عمدہ ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ اور اسی تفصیل سے وہ بمبئی، دلی اور کراچی کے ایک ایک ہوٹل اور ...... اور ایک ایک حلوائی کی بانگی بیان کر سکتے تھے۔

غالباً ۱۹۴۰ء میں ماہرؔ صاحب فلمی دنیا کی سیر کی غرض سے بمبئی چلے گئے اور اس فن میں بھی خاصا نام کمایا مگر مزاج کو یہ رنگین دنیا پسند نہ آئی اور وہاں سے

مراجعت ہوگئی۔ میں ۱۹۴۲ء میں جب مستقل طور پر دلّی آگیا تو ماہر صاحب کو دلّی میں موجود پایا۔ پھر کیا تھا وہاں بھی تقریباً روزانہ ملاقات رہنے لگی، وہاں بھی ماہر صاحب شعر و سخن کی خوب خوب داد پاتے۔ مشاعرے مارتے کے علاوہ اس زمانے میں شائد ہی کوئی رسالہ ہوگا جس میں ماہر صاحب کا کلام شائع نہ ہوتا۔ ساقی سے لے کر مست قلندر تک میں ان کا کلام تقریباً ہر اشاعت کی زینت بنتا۔ دلّی کے جگری دوستوں میں نخشب جارچوی اور صابر دہلوی تھے، صبح و شام ماہر صاحب ان ہی کے ساتھ نظر آتے۔ ماہر صاحب نے سبزی منڈی میں ایک گھر بھی لے لیا تھا جو تقسیم ہند کے ہنگاموں میں چھوڑنا پڑا۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان عمل میں آیا، ماہر صاحب کراچی میں اور میں لاہور میں آکر آباد ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں ریڈیو پاکستان کا صدر دفتر اور خبروں کا شعبہ کراچی میں منتقل ہوا تو میں بھی کراچی آگیا، اور یہاں پھر دیرینہ ملاقاتیں تازہ ہوگئیں۔ ۴۷ء سے ۷۸ء تک شائد ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا، جب ماہر صاحب سے ٹیلیفون پر کسی مشاعرے، کسی دعوت یا خود ان کے گھر ملاقات نہ ہوتی ہو، وہ کبھی کبھی میرے یہاں آجاتے، ان ملاقاتوں کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

یقین نہیں آتا کہ مولانا ماہر القادری ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے مجھے کسی طرح ان کی موت یا ان کی جدائی محسوس نہیں ہوتی، جانے کیوں؟ یا تو ان کی شخصیت کی تازگی یہ احساس نہیں دلاتی یا اپنے تعلقات کی گہرائی اس تاثر کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہونے دیتی۔ جدہ جانے سے ایک روز پہلے وہ میری عدم موجودگی میں فاران کے پرانے رسالے لینے میرے گھر آئے اور میری بڑی بیٹی سے مزے مزے کی باتیں کرتے رہے، جب میری بیٹی نے یہ خبر سُنی تو وہ رات بھر نہ سو سکی۔

بیسیوں مشاعروں میں ماہر صاحب کے ساتھ سفر کا موقع ملا اور ہر دفعہ یہ محسوس ہوا کہ اگر ماہر صاحب ساتھ نہ ہوتے سفر بے مزہ رہتا۔ ہر سفر میں ان کے مزاج کی جلد بازی کسی نہ کسی لطیفے کو جنم دیتی، وہ اپنی دانست میں سفر کے تمام

لوازمات سے لیس ہو کر سفر کرتے مگر منزلِ مقصود پر پہنچ کر معلوم ہوتا کہ اوہو فلاں چیز بھول آئے یہ بھول ہم سب کے لئے سامانِ تفریح ہو جاتی۔ حیدر آباد سندھ کے ایک مشاعرے میں فاضل ازار بند لانا بھول گئے اور میلے پاجامے کا ازار بند جلد بازی میں اُجلے پاجامے میں ڈالنا چاہا تو وہ ٹوٹ گیا۔ بس پھر نہ پوچھیے کہ کیا عالم گذرا۔ ماہر کھانے پینے کے ہمیشہ سے شوقین تھے، کوئٹہ کے ایک مشاعرے میں ساتھ ہوا، بازار میں سیر کو نکلے تو ایک بڑا سا سردہ ماہر نے خرید لیا، میں نے کہا "مولانا آپ نے سردہ مہنگا خریدا ہے"۔ انہیں میری بات پسند نہ آئی۔ میں نے ایک سردے والے سے جو سو دو سو سردے لئے تھڑا لگا رہا تھا۔ بھاؤ پوچھا اس نے کسی حد تک میری تائید کی اور جب بات ختم ہو گئی تو ہم دونوں چلنے لگے اس نے مولانا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا:

"تھو! سردہ تو یہاں رکھو"۔ وہ سمجھا کہ مولانا نے یہ سردہ وہاں سے اُٹھایا ہے، جب میں نے بیچ میں پڑ کر اسے یقین دلایا یہ سردہ ہم نے دوسری جگہ سے خریدا ہے۔ جب اس نے مولانا کو چھوڑا۔ ماہر سے ہم لوگ بعض اوقات جان کر بھی تفریح لیتے ان تفریح لینے والوں میں پیش پیش اقبال صفی پوری ہوتے، اقبال ماہر سے بے پناہ محبت کرتے اور اسی محبت میں سرشار ہو کر ماہر بعض وقت اقبال سے روٹھ جاتے اور پھر منانے کے مناظر بھی قابلِ دید ہوتے مگر مولانا ذرا سی دیر میں پھر یاروں کے یار ہو جاتے۔

ماہر کو الفاظ کی تحقیق بلکہ "تفتیش" کا بڑا شوق و ذوق تھا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس معاملے میں کسی سے رُو رعایت نہ برتتے میری ان سے اس معاملے میں اکثر چپقلش رہتی مگر دوستی اور احترامِ دوستی میں وہ کبھی فرق نہ آنے دیتے ایک دفعہ میں نے کسی محفل میں کہہ دیا کہ فارسی میں تشدید نہیں ہوتی، دوسرے ہی دن ایک دس پندرہ صفحوں کا خط میری تردید میں مجھے لکھ مارا۔ دو چار روز بعد ایک محفل میں مجنوں گورکھپوری سے ملاقات ہوئی وہاں مولانا بھی تھے۔ میں نے مجنوں صاحب سے اپنی بات کی تائید چاہی انہوں نے میری تائید کی بس مولانا اُلجھ پڑے اور کسی طرح یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ فارسی میں تشدید نہیں ہوتی۔

۱۹۵۴ء میں کراچی میں جگر مرادآبادی مہینوں قیام پذیر رہے ، وہاں روز رت جگے ہوتے اور ان رت جگوں میں ماہر کی موجودگی اور رنگ بھرتی اور رات بھر ہنستے ہنستے بُرا حال ہو جاتا۔ جگر صاحب ماہر سے بہت محبت کرتے تھے مولانا کی اکثر کڑوی باتوں کا بھی بُرا نہ مانتے۔ ماہر صاحب بھی جگر کی شخصیت اور اُن کی شاعری کا دل سے احترام کرتے تھے۔ جگر صاحب کی محفلوں میں اقبال صفی پوری ، ادیب سہارنپوری مرحوم اور شعیب حزیں مرحوم بھی ہوتے یہ محفلیں اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں مگر ان کی یاد اب بھی دلوں کو گرماتی ہے۔

کراچی کے احباب میں تسنیم مینائی بھی مولانا کے خاص پرستاروں میں ہیں ، وہ بھی مولانا سے دو ایک روز پہلے عمرہ کرنے جدّہ روانہ ہوئے تھے ، یقیناً اُن کو بھی مولانا کی جدائی کا انتہائی صدمہ ہوا ہوگا ، وہ ان کی میت میں بھی شریک ہوئے ہوں گے مگر ہم کو یہ سعادت بھی نصیب نہ ہوئی۔ افسوس۔ مولانا ماہر کردار کے اعتبار سے نہایت مستحکم شخصیت کے مالک تھے ، وہ نہایت دیانتدار اور راست باز تھے ، وہ کردار ہی میں نہیں اپنے خیالات میں بھی نہایت دیانتدار تھے جہاں تک میرے علم میں ہے انہوں نے دانستہ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی ، وہ دوسروں کی تکلیف سے بے چین ہو جاتے اور اپنی مقدرت کے مطابق ہمیشہ دوسروں کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔ اپنے عقیدے میں بڑے پکّے اور عشقِ رسول ﷺ میں ڈوبے ہوئے تھے ، رسول اللہ ﷺ کا نام لیتے ہی آب دیدہ ہو جاتے اور دیر تک ان پر ایک عجیب عالم طاری رہتا۔ وہ حق و صداقت کے پرستار تھے حق بات کہنے میں کبھی نہ ہچکچاتے اور برملا کہتے خواہ ان کا مخاطب کوئی کیوں نہ ہو۔

ان کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا اس مختصر مدّت میں ممکن نہیں ، ان کی جدائی ایک بڑا سانحہ ہے ، ان کی جدائی سے کتنی آنکھیں اشکبار اور کتنے دل غمگین ہیں۔ مگر انہی غمگین دلوں کو اور ان ہی اشکبار آنکھوں کو یہ منظر بڑا دلکش معلوم دیتا ہے کہ وہ عاشقِ رسول ﷺ دیارِ رسول ﷺ ہی میں آسودۂ خاک ہوا ہے۔ ؎

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا !

بُرا آدمی

"تابش میں کیسا آدمی ہوں ؟"

"بخاری صاحب آپ بہت بُرے اور بہت اچھے آدمی ہیں !!"

"یہ کیا بات ہوئی ؟ آدمی اچھا ہوتا ہے یا بُرا ۔!"

یہ ٹھیک ہے ۔ آپ جب تک آدمی رہتے ہیں اس وقت تک بہت اچھے رہتے ہیں اور جب آدمی کی ایکٹنگ کرتے ہیں تو بہت بُرے ہو جاتے ہیں ۔"

"مگر میں بُرے آدمیوں سے آدمی کی ایکٹنگ کرتا ہوں اچھے آدمیوں سے نہیں !!"

عید کے دن محمد علی بوگرہ کے عید ڈنر میں جاتے ہوئے مجھے دفتر چھوڑتے وقت یہ گفتگو ہوئی ، وہ مجھے دفتر چھوڑ کر چلے گئے اور میں دیر تک "میں بُرے آدمیوں سے آدمی کی ایکٹنگ کرتا ہوں ، اچھے آدمیوں سے نہیں" کا فقرہ اپنے ذہن میں دُہراتا رہا ۔

کیا واقعی بخاری صاحب آدمی کی ایکٹنگ صرف بُرے آدمیوں سے ملتے وقت کرتے تھے یا وہ خود بھی بُرے آدمی تھے ؟ وہ خوشامد سے ناخوش بھی ہو جاتے ، نجی اور بے تکلف صحبتوں میں وہ ایک دم افسر بن جاتے ، کم سوادوں کو اعلیٰ درجوں پر فائز کرتے ، ٹُٹ پُونجیوں کو اچھی اچھی نوکریاں دیتے ، مشاہیر شعراء اور ادیبوں پر ذاتی پسند اور ناپسند کے لیبل لگاتے ۔ اہلِ پنجاب انہیں پنجابی ، لکھنؤ والے انہیں لکھنوی ، دِلّی والے انہیں دِلّی والا ، اہلِ تشیع انہیں شیعی اور اہل سنّت انہیں سُنّی سمجھتے ۔ وہ بچّوں میں بچّے ، نوجوانوں میں نوجوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے ، مزاج میں فقیری مگر رہن سہن شاہانہ ، لوگوں سے ان کے تہذیبی خول اُتار کر ملتے ، اچھائیوں کی طرح لوگوں کی بُرائیاں بھی ایک ایک آدمی سے بیان کرتے بخاری صاحب کے اسی مختلف جہت کردار نے انہیں مشکل آدمی بنا دیا اور دنیا والوں کی نظر میں ان کی یہ سب سے بڑی بُرائی تھی ۔

وہ پشاور کے رہنے والے تھے مگر ہندکو ، سرائیکی ، پنجابی ، فارسی ، انگریزی اور

اردو کے واقف اور دلدادہ تھے اور اسی طرح مختلف تہذیبوں سے ان کا خمیر اٹھا شعروادب میں وہ رحمٰن بابا، خوشحال خان، وارث شاہ، بھلے شاہ، بابا فرید، شیکسپیئر، حافظ، سعدی، اقبال، میر غالب اور حسرت کے عاشق تھے۔ ذوق، مومن، جوش، فانی اور جگر کو ناپسند کرتے، نشست و برخاست میں دہلوی اور لکھنوی انداز، رسم ورواج میں کبھی پشاوری کبھی پنجابی اور گھر کی آرائش بالکل انگریزی، انہی مختلف تہذیبوں کے خمیر نے ان کے کردار کے بہت سے رُخ قائم کیئے اور کوئی ایک متعین شکل نہیں دی۔

وہ ہر قبیل کے آدمی سے کچھ نہ کچھ اخذ کرتے، افسر بنکر آدمی کی نفسیات کا مطالعہ کرتے کم سوادوں سے کردار کی بلندی اور لقمان کی طرح بے ادبوں سے ادب سیکھتے، ادب و شعر کی ذاتی پسند اور ناپسند سے وہ ادبی ذوق کی تربیت کرتے۔

آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں مجھے ان سے ملاقات کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا۔ وہ بمبئی میں تھے اور میں دلی میں، ان سے پہلی ملاقات ۱۹۴۷ء میں لاہور میں ہوئی، ایک روز مجھ سے فرمایا " تابش صاحب پاکستان بن گیا ہے۔ اب دہلوی وہلوی نہیں چلے گا، میں نے عرض کیا بخاری صاحب دلی بخارا سے تو قریب ہے۔ اس جواب سے خوش ہوئے۔ اسی طرح ایک روز میں خبریں پڑھ رہا تھا، خبروں کے بعد مجھے طلب کیا کہنے لگے آپ دِلّی کے ہیں۔ یہ لفظ نشَست ہے یا نشِست، میں نے کہا میں دلی کا ہوں اور لفظ فارسی کا ہے اس کا تلفظ نِشَست ہے اس جواب پر مجھے غور سے دیکھا اور پھر محبت سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ۱۹۴۹ء میں خبروں کا شعبہ کراچی میں منتقل ہوا تو میں بھی کراچی آگیا اور بخاری صاحب کے اصرار پر ان کے یہاں شام کی صحبتوں میں حاضر ہونے لگا۔ شام کے حاضر باشوں میں محشر بدایونی، ارم لکھنوی، حمید نسیم، حفیظ ہوشیارپوری، سلیم گیلانی، رشید تبسم، زیبا ردولوی اور ریڈیو کے بعض افسر ہوتے۔ ان صحبتوں میں نہایت دلچسپ موضوع زیرِ بحث آتے۔ ہم لوگ رات کا کھانا اکثر بخاری صاحب کے یہاں کھاتے اور رات گئے جب یہ محفلیں برخاست ہوتیں، تو اپنی موٹر میں بخاری صاحب ہر شخص کو گھر چھوڑ کر آتے۔

میں ۱۹۵۰ء میں حلقۂ اربابِ ذوق کراچی کا سیکریٹری تھا حلقہ کا سالانہ اجلاس بڑے دھوم دھام سے ہوا۔ اسٹیٹ بینک کے گورنر زاہد حسین نے صدارت کی۔ اسی سلسلے میں ایک ہندو پاکستان مشاعرے کا بھی اہتمام ہوا۔ اس کو کامیاب بنانے میں ممتاز حسن، الطاف گوہر اور ضیا جالندھری پیش پیش تھے۔ یہ مشاعرہ وائی ایم سی اے میں ہوا۔ ہندوستان سے ہری چند اختر، جگن ناتھ آزاد اور رزم ردولوی نے شرکت کی، مشاعرے کے دوسرے روز بخاری صاحب نے اپنے یہاں عشائیہ اور مشاعرہ ترتیب دیا۔ شعرا میں آل رضا، احسان دانش، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، حامد لکھنوی، قمر جلالوی، ارم لکھنوی، نہال سیوہاروی، ادیب سہارنپوری، ماہر القادری، شمس زبیری، شعیب حزیں، جگن ناتھ آزاد، رزم ردولوی، حمید نسیم، حفیظ ہوشیارپوری، ندیم قاسمی، احمد فراز، محشر بدایونی، جمیل الدین عالی، شان الحق حقی، سما انصاری، غرض تمام خوش گو شعرا تھے۔ مشاعرے میں حفیظ جالندھری پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے بخاری صاحب نے حفیظ سے کہا یہ بزم ادب ہے ادب سے بیٹھئے اور اس طرح انہوں نے میر درد کی تہذیبی روایت کو زندہ کر دیا۔ ہر چند بخاری صاحب نہ خواجہ میر درد تھے اور نہ حفیظ شہزادے!!

غالباً ۱۹۵۲ء میں آرزو لکھنوی کراچی آ گئے۔ ان کے آنے سے کراچی کی ادبی زندگی میں گہما گہمی پیدا ہو گئی۔ روز کہیں نہ کہیں دعوت اور مشاعرے ہوتے لگے، بخاری صاحب کے یہاں بھی ادبی محفلیں جمنے لگیں۔ ان میں شہر کے تمام خوش گو شعرا مدعو کئے جاتے اور خوب خوب دادِ سخن پاتے۔ اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان کراچی میں ایک مشاعرہ ہوا اس میں لکھنوی شعرا زیادہ مدعو تھے، دلّی کے ایک معروف شاعر حیدر دہلوی بھی مدعو تھے، بخاری صاحب پر اس زمانے میں لکھنوی رنگ زیادہ غالب تھا۔ دوران نشر بخاری صاحب نے مشاعرے کی داد کو کچھ ایسا رنگ دیا جس سے حیدر دہلوی کی سبکی ہوتی تھی۔ جمیل الدین عالی نے اس انداز کو بھانپ لیا اور وہیں بگھر گئے غرض مشاعرے کے بعد بخاری صاحب اور عالی میں خاصی بدمزگی ہو گئی، اتفاق سے مشاعرے کے

بعد ایک دعوت میں جانا تھا۔ میں، شعیب حزیں اور ارم لکھنوی دعوت میں بخاری صاحب کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ فرمایا "تابش آج کے واقعے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے"؟ سوال ٹیڑھا تھا، میں نے عرض کیا "صاحب زیادتی آپ کی تھی" کہنے لگے "اگر دلّی والوں کے مقابلے میں لکھنؤ والے شعر اچھا کہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں"۔ میں نے عرض کیا کہ "لکھنؤ والوں نے پوری ادبی تاریخ میں شعر اچھا نہیں کہا ایک لے دے کے آتش ہیں۔ ان پر بھی دہلویت کی چھاپ ہے اور ویسے بھی لکھنوی شاعری میں سوائے چونچلے اور نخرے کے ہوتا کیا ہے"؟ فوراً بولے۔ "اور داغ کے یہاں کیا ہے"؟ میں نے کہا "جی ہاں داغ کے یہاں بھی چونچلے اور نخرے ہیں۔ لیکن رنڈی باز کے ہیں رنڈی کے نہیں!!" اس فقرے کے بعد ان کا سارا غصہ دور ہو گیا اور میرے فقرے کا دیر تک مزہ لیتے رہے۔

ریڈیو بخاری صاحب کی زندگی تھا۔ وہ زندگی ہی کی طرح اس کی آرائش کرتے تھے۔ یہ گملہ یہاں رکھا جائے گا یہ بلب یہاں لگے گا۔ اس اسٹوڈیو کی میز کا کپڑا اور پردے اس رنگ کے ہوں گے۔ اس دیوار پر یہ رنگ ہوگا۔ چھت کی زیبائش اس طرح ہوگی غرض ریڈیو کی ہر آواز، ہر پروگرام بخاری صاحب کو زندگی کی طرح عزیز تھا۔ ذرا خرابی پیدا ہوئی اور ان کی روح نے کرب محسوس کیا۔ وہ ہمہ وقت ریڈیو اور ریڈیو والوں کی بہبود میں منہمک رہتے اور اپنے آپ کو اسی ایک لگن میں لگائے رکھتے، دراصل بخاری صاحب دکھی آدمی تھے۔ ان کا سب سے بڑا دکھ احساسِ تنہائی تھا جسمانی اور ذہنی تنہائی۔

بخاری صاحب کے مزاج میں فقیری کا عنصر انھیں وراثت میں ملا تھا۔ وہ پیروں کی اولاد تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ کسی کو مفلوک الحال دیکھ کر بے چین ہو جاتے۔ لوگوں کی مدد چھپا کر کرتے، کسی کو روپے دیتے کسی کو اپنے کپڑے دے دیتے اور کانوں کان کسی کو خبر نہ ہونے دیتے اور پھر یہ بھی ہوتا کہ اپنے سگریٹوں کے لئے وہ دوسروں سے بھی پیسے مانگ لیتے نہ کبھی لے کر واپس کرتے اور نہ کبھی دے کر مانگتے۔

دوسروں کی ذرا سی خوشی کے لئے وہ بڑی سے بڑی بات کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔

ایک دفعہ انجمن ترقی اُردو کراچی نے چندے کی فراہمی کے لیئے ایک وفد میجر آفتاب حسن کی سرکردگی میں کوئٹہ بھیجا اور کوئٹہ ہی میں ایک کل پاکستان مشاعرے کا انتظام کیا، اس مشاعرے میں جگر مراد آبادی (جو اِن دنوں کراچی آئے ہوئے تھے) ادیب سہارنپوری، تسنیم مینائی، سید محمد جعفری، ماہر القادری اقبال صفی پوری اور کوئٹہ کے کچھ مقامی شاعر شریک ہوئے۔ بخاری صاحب ان دنوں کوئٹہ ریڈیو اسٹیشن کے افتتاح کے لیئے کوئٹہ گئے ہوئے تھے ان کو جب اُردو کے لیئے چندے کی فراہمی کی تحریک کی خبر ہوئی تو وہ چار پانچ روز تک ہم لوگوں کو ساتھ لے کر ایک ایک سردار کے پاس گئے اور کچھ پشتو اور کچھ اردو بول کر ان سے کئی ہزار روپے وصول کر لائے۔

بخاری صاحب کے کردار کے اتنے پہلو ہیں کہ انہیں کسی مقررہ اور متعین کردار کا آدمی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ باہمہ بروا و بے ہمہ شو پر عامل تھے۔ وہ تنہائی میں ایک انجمن اور انجمن میں تنہا تھے۔ زندگی کے معاملات پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ انسان کا اچھا مطالعہ رکھتے تھے میں نے ان کا طنطنہ بھی دیکھا ہے اور انہیں معمولی معمولی باتوں پر روتے بھی دیکھا ہے۔ ان کی افسری بھی دیکھی ہے اور ماتحتوں سے ان کا سلوک بھی دیکھا ہے۔ دوستوں پر ان کی شفقت اور رنجشیں بھی نظر سے گزری ہیں۔ بزم شعر و ادب میں ان کی شائستگی اور تہذیب کے منظر بھی سامنے ہیں اور ان کی داد و دہش اور ان کی کجز رسی بھی نظر میں ہے۔

بخاری صاحب محمد علی بوگرہ کے عید ڈنر میں نہیں اب بہت دُور چلے گئے ہیں۔ مگر میرے ذہن میں اب بھی یہ فقرہ کبھی کبھار گونجتا ہے "میں آدمی کی ایکٹنگ بُرے آدمیوں سے کرتا ہوں اچھے آدمیوں سے نہیں"۔

کیا واقعی بخاری صاحب آدمی کی ایکٹنگ کرتے تھے یا وہ تھے ہی بُرے آدمی۔

اتوار کے اتوار

آکا سلیم بیگ میرے رشتے کے سالے تھے، وہ رشتے میں مجھ سے چھوٹے مگر عمر اور اخلاق میں مجھ سے بڑے تھے، اتوار کے اتوار ان کے گھر احباب کی بیٹھک ہوتی، سفید چاندنی کا فرش قرینے سے گاؤ تکیے اور گل تکیے رکھے ہوئے، اُگال دان، پانی کا جگ اور گلاس سلیقے سے دھرے ہوئے اور

بیچوں بیچ آکا کا خوبصورت اور مسکراتا ہوا جسم کسی تکیے کے سہارے ٹکا ہوا۔ احباب کی اس بیٹھک میں بھکڑ پن سے لے کر شعر و ادب کے مسائل تک غرض بھی کچھ ہوتا۔ اکثر دوپہر کا کھانا ہم لوگ مل کر کھاتے، کبھی آکا اہتمام کرتے اور کبھی احباب ایک ایک ڈش لے آتے۔ ان محفلوں میں جگر مراد آبادی اور حسرت بدایونی بھی شریک ہوئے ہیں، یہ دونوں اس زمانے میں کراچی آئے ہوئے تھے۔

بخاری صاحب اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ان محفلوں میں شریک ہوتے اور کہتے کہ مجھے آکا کے پاس آکر دلی کی تہذیب کے مزے ملتے ہیں۔ وہ ہر محفل کو اپنی بذلہ سنجی اور دلچسپ باتوں سے یادگار محفل بنا دیتے، کبھی فارسی شعراء زیر بحث آتے اور وہ ان کے مدارج مقرر کرتے کبھی وہ ذوق کی مخالفت میں غالب کے طرفدار بن جاتے اور خوب خوب باتیں کرتے، اردو شعراء میں میر و سودا، غالب و اقبال اور حسرت ان کے پسندیدہ شاعر تھے، فانی، جگر اور جوش کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ ان شعراء کے متعلق اکثر گفتگو رہتی مگر ان کی مخالفت میں ان کی دلیلیں اکثر کمزور ہوتیں۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا تم فانی کے بڑے پرستار ہو کوئی اچھا شعر سناؤ، مطلب یہ تھا کہ فانی نے اچھا شعر کہا ہی نہیں ہے، میں نے کہا جہاں سے فرمائیں پڑھنا شروع کر دوں اس سے میرا مطلب تھا کہ فانی کا سارا کلام منتخب ہے اور مزید انتخاب کی ضرورت نہیں، میں نے شعر پڑھنے شروع کئے! اور جب یہ شعر پڑھا

خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانی
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

تو فرمایا اماں تابش اس میں تو زباں کی بھی غلطی ہے مصرع یوں ہونا چاہیئے تھا۔ ع

آئینہ ان کے مقابل نہیں ہونے پاتا

میں نے عرض کیا بخاری صاحب آپ آئینے کو LOOKING GLASS سمجھ رہے ہیں یہاں آئینے سے مراد وہ اعیان و مظاہر ہیں جس میں حسنِ ازل منعکس ہوتا ہے اور جمع کا صیغہ عمومیت کیلئے استعمال ہوا ہے غرض خوب خوب بحث ہوئی، جاتے وقت مجھ سے کہنے لگے، فانی کی کتابیں کل دفتر میں مجھے پہنچا دینا۔

ایک دفعہ بخاری صاحب آئے تو ان پر غالب کی طرفداری کا موڈ زیادہ طاری تھا اور وہ یہ شعر پڑھ کر جھوم رہے تھے ۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ‏ ‏ ‏ دل جگر تشنۂ فریاد آیا

اور پڑھتے پڑھتے وہ اس شعر کو گنگنانے لگے، شعر گنگنانے میں انھوں نے "دل جگر" ایک ساتھ پڑھا اور "تشنۂ فریاد" کو الگ کر کے پڑھا، مجھے شرارت سوجھی میں نے کہا بخاری صاحب غالب کا یہ شعر سمجھ میں نہیں آتا گنجلک ہے، فرمایا سیدھی بات ہے دل اور جگر تشنۂ فریاد تھے اس لئے بار بار دیدۂ تر یاد آتا ہے میں نے عرض کیا غالب کا غالباً "دل تشنۂ فریاد تھا کہنے لگے اور "جگر بھی" میں نے کہا جگر کا تو اس شعر میں کہیں ذکر نہیں کیوں کہ یہ مصرع یوں ہے "دل۔ جگر تشنۂ فریاد آیا" یعنی غالب دل کو جگر تشنۂ فریاد کہتے ہیں اور فارسی اور بعض شعراء اردو کے یہاں "جگر خام" اور "جگر تشنہ" ایک ہی لفظ کے طور پر استعمال ہوا ہے جیسے میر درد کا مصرع ہے ع

دل وہ کباب تھا کہ جگر خام رہ گیا

اس جواب کو سن کر خاموش ہو گئے، میرا خیال ہے وہ میرا امتحان لینا چاہتے تھے۔ بخاری صاحب کی ہمہ جہت شخصیت نے نئے روپ دکھائی تھی، ایک دفعہ بخاری صاحب اپنے ہاتھ کے پکائے ہوئے سالن اور صوفی صاحب کے تنّور کی روٹیاں لائے۔ یہ صوفی صاحب صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے بھائی ہیں اور ان کے تنّور کی روٹی واقعی بہت عمدہ ہوتی ہے۔ بخاری صاحب خود نہایت کم خوراک تھے مگر احباب کو کھلا کر خوش ہوتے اور اس کے لئے بڑا اہتمام کرتے، اس روز کا کھانا واقعی نہایت لذیذ تھا اور حیرت ہوئی کہ بخاری صاحب نہ صرف یہ کہ کھانا کھلانے میں خوش مذاق ہیں بلکہ خود بھی عمدہ کھانا پکا لیتے ہیں۔

آغا سلیم بیگ کی یہ محفلیں جب تک احباب زندہ ہیں دلوں کو اپنی یادوں سے گرماتی رہیں گی، مجھے ان محفلوں میں بیٹھ کر حیدرآباد دکن میں چندو لعل کا دیوان خانہ جس کا ذکر اکثر سنا اور دلّی میں لالہ سری رام کا دیوان خانہ جسے میں نے دیکھا اکثر یاد آجاتے۔ ان یادوں کے ساتھ بعض بزرگوں اور دوستوں کی بھی یاد حرزِ جاں ہے۔ بخاری صاحب اب ہم میں نہیں مگر یہ یقین کرنے کو کسی طرح دل آمادہ نہیں ہوتا کہ وہ مر گئے ہیں۔

———·×:(※):×·———

خواجہ محمد شفیع دہلوی

"ہائے دلّی وائے دلّی بھاڑ میں جائے دلّی" یہ نعرہ غالب نے اُس وقت لگایا جب اپنی عظمت کی زوال پذیری کے باوجود دلّی دلّی تھی۔ قلعہ میں بہادر شاہ ظفر مغلیہ عظمت کی آخری نشانی تھے ادبی میدان میں شاہ نصیر مومنؔ ذوقؔ آغا جان عیشؔ صہبائیؔ صدرالدین آزردہؔ ضیاء الدین نوجوان ہیں سرسید ڈپٹی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ تھے۔ مذہبی بساط پر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین تھے۔

تصوّف کی مسند پر حضرت فخر جہاں مولانا فخر الدین کے خانوادہ کے فرد فرید حضرت کالے صاحب۔ غرض زوال آمادگی کے باوجود دلّی واقعی دلّی تھی۔ غالب کے اس نعرے کے دو معنی نکلتے ہیں ایک اس کی بگڑتی ہوئی صورت حال کا اشارہ ہے اور دوسرا اس کی عظموں کا اظہار!!

"ہائے دلّی وائے دلّی بھاڑ میں جائے دلّی" کا نعرہ غالب ہی کے ساتھ ختم نہیں ہوا بلکہ اس کی گونج ہمارے زمانے میں بھی سنائی دیتی رہی، اپنے لڑکپن اور جوانی میں دلّی کی عظمتوں کی جن نشانیوں کو ہم نے دیکھا ان میں وہ بزرگ بھی تھے جو اسلامی ہندی تہذیب کے مُنام تھے اور جن کو دیکھ کر دلّی کی عظمتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ادب اور شعر کے میدان میں میر ناصر علی، ناصر نذیر فراق، باقر علی داستاں گو، بیخود دہلوی، سائل دہلوی، آغا شاعر قزلباش، پنڈت امرناتھ ساحر، تربھون ناتھ زار زتشی، شیدا دہلوی، راشد الخیری، قاری سرفراز حسین، خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، مولوی بشیر الدین، پروفیسر مرزا محمد سعید، مولوی احتشام الدین، گوپی ناتھ امن لکھنوی اور خواجہ عبدالمجید جیسی ہستیاں تھیں۔ تصوف میں خواجہ حسن نظامی اور میاں عبدالصمد کا شہرہ تھا، سیاست میں حکیم اجمل خان اور آصف علی بیرسٹر سرگرم تھے حکمت میں حکیم محمد احمد کا نام تھا ان کے علاوہ ایک اور شخصیت مرزا چپاتی کی تھی جو بہادر شاہ کے پوتے تھے بڑے خوبصورت اور وجیہ رو تھے شعر بھی کہتے تھے دلّی والے اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ دلّی میں دو طوائفیں

دوانی اور چونی کے نام سے مشہور تھیں، مرزا صاحب نے ایک کے بارے میں شعر کہا:

گھستے گھستے ہو گئی کیسی ملٹ
چار پیسے کی دوانی رہ گئی

غرض دلی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی آماجگاہ تھی اور ان بزرگوں کے زیرِ سایہ بہت سے نوجوان بھی دلی کی تہذیبی زندگی میں اُجالے بکھیر رہے تھے ان میں شاہد احمد دہلوی، انصار ناصری، فضل حق قریشی، ظفر قریشی، صلاح الدین قریشی، صادق الخیری، مہاراج بہادر برق، کیف دہلوی، ولی اشرف ظفر تاباں اور خواجہ عبدالمجید کے صاحبزادہ خواجہ محمد شفیع وغیرہ تھے۔

دلی کی تہذیبی زندگی میں خالص دلی والے یعنی شرفاء کے وہ خاندان جو صدیوں سے دلی میں قیام پذیر تھے اور وہ کرخندار بھی جن کے باپ دادا کی مٹی دلی ہی کی تھی خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ دلی میں پنجابی سوداگراں کی بھی اپنی شناخت تھی اور نام کے سوا پنجابیت کی کوئی خُو بُو ان میں نہیں تھی اور یہ تمام طبقے ایک وحدت ہونے کے باوجود، تہذیب، رسم و رواج اور اپنی زبان الگ رکھتے تھے دریائے لطافت میں انشاء اللہ انشاء نے ان کی بولیوں کا ذکر کیا ہے۔ شرفاء کی زبان الگ تھی، پنجابی سوداگراں خاص کر قریشی برادران (جوتے والے) کی بولی بھی خاصی الگ تھی، دلی کا کرخندار طبقہ تہذیبی زندگی میں بڑا فعال تھا اور دلی جس کے متعلق مثل تھی "آٹھ دن نو میلے" اسی طبقہ کی وجہ سے اپنی تہذیبی شناخت دوسرے شہروں سے مختلف رکھتی تھی۔ سلطان جی صاحب کی سترھویں ہو، چھڑیوں کا میلہ ہو، پھول والوں کی سیر ہو، بسنت ہو، جمنا کی سیر ہو، برسات میں قطب صاحب کی سیر ہو تہوار الگ رہے۔ غرض یہ ساری رنگا رنگی انہی کے دم سے تھی، اور انہی کی وجہ سے دلی کی باقی آبادی بھی ان میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتی اور اس شرکت کا نتیجہ یہ نکلا کہ کرخنداروں کی بعض رسم و رواج کے ساتھ ساتھ ان کی بولی کے بہت سے لفظ بھی شرفا کی زبان میں داخل ہو گئے۔ کرخنداروں کا طبقہ زبان کی ایجاد میں بلا کا فطین اور ذہین تھا اور نئے نئے لفظ ایجاد کر کے زبان کے طرح طرح کے اسلوب اختراع کرتا مثلاً (AIRCONDITION - BOGY) وہ گاڑی جس میں سرحد سے پھل آتے تھے اس کا نام انھوں نے "ٹھنڈی گاڑی" رکھا تھا۔

اسی طرح تاش کو پھینٹنے یا SHUFFLE کرنے کو "تاش کو چکما دینا" بولتے ۔غرض یہ تھی میرے لڑکپن اور جوانی کی دلّی اور دلّی والے خواجہ محمد شفیع کے والد خواجہ عبدالمجید گورے چٹے اور چوڑی ہڈی کے خوش وضع اور ثقہ بزرگ تھے لوگ ان کی عزت کرتے تھے، وہ مٹیا محل کی ایک گلی میں (نام یاد نہیں) جس میں لالہ سری رام کا دیوان خانہ بھی تھا' ایک وسیع و عریض سنگ سرخ کی حویلی میں رہتے تھے، خواجہ صاحب شاہانہ مغلیہ کے زمانے کے (غالباً) روشن آرا وقف کے متوّلی بھی تھے۔ اس وقف کا ایک دینی مدرسہ مولوی مفتی کفایت اللہ کی سرپرستی میں تھا یہ مدرسہ کشمیری دروازہ میں سنگ سرخ کی ایک مسجد میں قائم تھا اور یہ مسجد بھی اسی وقف کا حصہ تھی، خواجہ عبدالمجید کا انتقال قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں ہوا۔

دلّی میں خواجہ محمد شفیع جانی پہچانی شخصیت تھے، گورا چٹا رنگ، درمیانہ قد اکہرا بدن، عام طور پر انگریزی لباس زیب تن رکھتے، تعلیم بی اے تک تھی اولاد میں تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں' گھر سے فارغ البال تھے اس لئے زندگی فراغت سے بسر کرتے تھے، خواجہ محمد شفیع طلاقت زبان میں ید طولیٰ رکھتے تھے ضلع جگت' پھبتی' فقرہ' پھکڑ' غرض کسی گھر بند نہیں تھے، کرخنداری بول کر خنداروں سے زیادہ عمدہ بولتے اور اس طرح وہ دلّی کی مجلسی زندگی میں نمایاں مقام رکھتے تھے' ادب سے بھی شغف تھا اور وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے' ان کتابوں میں خواجہ درد کے دیوان کا انتخاب' دلّی کی شخصیتوں کے خاکے (نام یاد نہیں) اور ایک ناول "ناکام" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں' اس ناول میں ایک تماش بین کے عشق کی داستان ہے۔ خواجہ صاحب کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں (۱) میونسپل الیکشن (۲) دلّی کی آوازیں (۳) دلّی کا سنبھالا (۴) میلاد شریف (۵) مغلوں کا مدوجذر (۶) شرح دیوانِ میر درد (۷) ہم اور وہ (۸) رُوپ متی (ڈرامہ) (۹) گناہ ڈرامہ (۱۰) ناکام (۱۱) چند افسانے (۱۲) ایک حمام میں (۱۳) سنگ منگاتی (۱۴) قمر (۱۵) شمع خرابات (۱۶) ابلیس (۱۷) اسٹرائیک وغیرہ' ان کے دولت کدہ پر ہر اتوار کو مشاعرہ ہوتا جس میں معروف شعرا کے ساتھ ساتھ وہ شعرا بھی حصہ لیتے جنہیں کہیں اور شعر سنانے کا موقع میسر نہ آتا' غرض خواجہ شفیع کی ذات بڑی باغ و بہار تھی' احباب کا مجمع ہر وقت رہتا' اور اس طرح خواجہ صاحب پُر مسرت زندگی بسر کرتے۔

دوسری جنگ عظیم کی پروپگنڈے کی مہم میں وار فرنٹ کے مشاعرے بھی شامل تھے جو شہروں شہروں

ہوتے، خواجہ صاحب کی شخصیت دلّی کے باہر بھی ادبی ذوق کی وجہ سے معروف تھی اس لئے اکثر مشاعروں کی ترتیب اور معلّی کے فرائض خواجہ صاحب کے سپرد ہوتے، خواجہ صاحب مشاعروں کی نظامت میں منفرد انداز رکھتے اور اپنی زبان دانی اور طلاقت زبان کے وہ جوہر دکھاتے کہ سامعین شاعروں سے زیادہ خواجہ صاحب کو داد دیتے، مثلاً اگر کسی اختر تخلص کے شاعر کو شعر خوانی کی دعوت دینی ہے تو خواجہ صاحب تخلص کی مناسبت سے رات کے وہ سارے تلازمات بیان کریں گے کہ سامعین کے سامنے رات کا نہایت دلکش منظر آجائے غرض دلّی کی زندگی میں خواجہ شفیع کی ذات کے جوہر خوب خوب نکھرتے اور اس طرح ایک رنگا رنگ فضا قائم تھی۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد خواجہ شفیع کا خاندان بھی مہاجر بن کر لاہور آگیا، یہاں ابتدائی دنوں میں گزر بسر مشکل ہوئی، پھر شکر کی درآمد کا لائسنس مل گیا جس کی وجہ سے خاصا سہارا ملا، وہ لاہور میں ہمدرد دواخانے کے جنرل منیجر بھی ہو گئے۔ دلّی کی جائداد جس کا متولی ان کا خاندان تھا اس کے متبادل ان کو لاہور میں کوئی جائداد غالباً نہ مل سکی، مگر جیسے تیسے بیڈن روڈ پر ان کو ایک عمارت الاٹ ہو گئی اور اب پھر زندگی فراغت سے بسر ہونے لگی۔

خواجہ صاحب لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں دوبارہ سرگرم ہو گئے اور ان کی زبان دانی یہاں بھی ان کی پذیرائی کا سبب بنی، وہ لاہور کے کسی کالج میں اردو پڑھانے پر بھی مامور ہو گئے تھے۔ اسی زمانے میں کنیڈا کا ایک مستشرق ڈاکٹر بارکر ان کو مونٹریل لے گیا اور وہاں کسی یونیورسٹی (غالباً میک گل یونیورسٹی میں) دو سال تک اردو پڑھاتے رہے، واپس آئے تو بالکل بدلے ہوئے، چہرہ پر لمبی ڈاڑھی، صوم و صلوٰۃ کے شدت سے پابند، لباس میں کرتا پاجامہ اور گفتگو میں بھی وہ طلاقت ناپید، خواجہ صاحب قناعت پسند آدمی تھے اس لئے زندگی سکون سے بسر کی ان کا بڑا بیٹا ہارون ٹھیکیداری کرتا ہے اسی کے ساتھ رہے، لاہور کینٹ میں ایک کوٹھی بنالی تھی اسی میں رہتے تھے، میں ۱۹۸۰ء میں لاہور گیا تو خواجہ صاحب سے ملنے گیا، بالکل فریش اور دائم المرض تھے، پلنگ سے اٹھ نہیں سکتے تھے، مجھے دیکھ کر رونے لگے، جی بحال ہوا تو کراچی میں رہنے والے ایک ایک دلّی والے کو پوچھتے رہے، حال ہی میں ان کے انتقال کی خبر سنی، دل کو دھچکا لگا اور کانوں میں پھر یہ نعرہ گونجا:

"ہائے دلّی وائے دلّی بھاڑ میں جائے دلّی"

محشر بدایونی — ایک جائزہ

پان اور غزل.... اصل میں دونوں ایک ہیں اور محشر بدایونی انہی دونوں سے عبارت ہیں وہ پان بہت کھاتے ہیں اور خوب خوب غزلیں کہتے ہیں۔ پان ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ اور غزل ہماری تہذیب کی ترجمان اور نمائندہ۔ وہی غزل گو بڑا شاعر ہے جس کا تہذیبی ورثہ بڑا ہے۔ تنقید میرا منصب نہیں۔ میں تو فاروق احمد محشر بدایونی کو آپ سے نہیں بلکہ آپ کو فاروق احمد محشر بدایونی سے متعارف کراتے آیا ہوں۔

جب شکیل بدایونی شعروادب میں نابالغ تھے دلّی میں ان کے ساتھ ایک صاحبزادے جن کی عمر سولہ سترہ سال ہوگی اکثر نظر آتے درمیانہ قد، گداز جسم بھرے بھرے گال، گندمی رنگ، کتابی چہرہ، ستواں ناک سر پر گھنے بال۔ صاحبزادہ میں نے اس لئے کہا کہ محشر بدایونی کو میری عمر معلوم ہے۔ بزرگی بعقل است کا میں تو قائل ہوں مگر کیا کیجئے بعض بوڑھے ایسے شعر بھی کہہ گئے ہیں ؎

تیرے بچپن کے دیکھنے والے\
یاد اپنا شباب کرتے ہیں

میں نے ان کے لڑکپن میں ان کو دیکھا ایک مشاعرے میں ان سے اور اِن کی شاعری سے تعارف ہوا نظم کا عنوان "تاج محل" تھا اور ان کا تخلص محشر بدایونی، اسی زمانے میں ان کا ایک شعر مشہور ہوا ؎

پژمردگیٔ گل پہ ہنسی جب کوئی کلی!\
آواز دی خزاں نے کہ تو بھی نظر میں ہے

شعری مذاق کا یہ سبھاؤ گرویدہ کرنے کے لئے بہت تھا اب مشاعروں کے علاوہ بھی ان سے کبھی کبھی ملاقات ہونے لگی۔ مگر یہ ملاقاتیں تکلفات سے آگے نہ بڑھیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد کراچی کے ادبی حلقوں میں محشر بدایونی سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں اور یہ ملاقاتیں دوستی میں اور یہ دوستی محبت اور یگانگت میں بدلتی گئی، لیکن

اس کے باوجود سے

ابھی ہیں قرب کے کچھ اور مرحلے باقی

کہ تجھ کو پا کے ہمیں پھر تری تمنّا ہے

ایک زمانے میں مجھ میں اور محشؔر میں قدرِ مشترک جناب زیڈ اے بخاری تھے، افسر کی حیثیت سے بھی اور شعر و شاعری کے لحاظ سے بھی۔ محشؔر زیادہ "مقرب" تھے اور روز کے حاضر باشوں میں اور میں کبھی کبھار کے جانے والوں میں، محشؔر کو یہاں میں نے پُروقار، محتاط اور خوددار پایا وہ اقرب ہونے کے باوجود دوسروں کے لئے کبھی عقرب ثابت نہیں ہوئے انہوں نے اپنی عزّتِ نفس کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا اور سچّی بات بے لاگ کہی۔

محشؔر مخصوص دوستوں میں بڑے دلچسپ آدمی ہیں، وہ بہت اچھی پھبتی کہتے ہیں۔ اور بعض وقت باتوں باتوں میں نہایت معصومانہ انداز میں خوفناک شرارت کر گزرتے ہیں۔ وہ بے وقوف بن کر جب دوسروں کو بے وقوف بناتے ہیں تو مجھے بدایون کے لله یاد آجاتے ہیں۔ ان کی حرکتیں کبھی کبھی عجیب ہوتی ہیں مثلاً وہ آپ کے یہاں آئیں آپ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کسی کام سے دو منٹ کے لئے اندر جائیں اور پھر واپس آئیں تو محشؔر ندارد، آپ دل میں کہیں گے عجیب آدمی ہیں!! تھوڑی دیر بعد وہ نمودار ہو جائیں گے اور آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ پان کھانے بازار گئے تھے حالانکہ پان انہیں آپ کے یہاں بھی مل سکتا تھا میں نے انہیں بازار کے پان کے لئے کئی کئی فرلانگ پیدل چلتے دیکھا ہے۔ میرا ان کا ساتھ سفر میں بھی بارہا ہوا مگر میں نے انہیں دوسروں کے لئے باعثِ زحمت نہیں پایا وہ اپنے بوجھ کے آپ ہی مزدور ہوتے ہیں۔ محشؔر نہایت ذہین اور فطین ہیں۔ بدایون کے سب لوگ ذہین اور فطین ہوتے ہیں، وہ باہمہ شو اور بے ہمہ رو پر کاربند ہیں۔ انجمن میں تنہا اور تنہائی میں انجمن، میں نے انہیں ہمیشہ بند بند پایا معلوم نہیں چشمِ عقدہ کشا سے بھی کھلتے ہیں یا نہیں؟ وہ مزاج کے کھرے ہیں۔ کھرا آدمی ہمیشہ کھرّا ہوتا ہے۔ وہ اپنی نفرتوں اور محبتوں میں شدید ہیں، قصور معاف کر دینا ان کا شیوہ نہیں وہ خفا دیر میں ہوتے ہیں مگر خفا ہو جاتے ہیں تو دیر تک خفا رہتے ہیں۔ وہ سخت باتیں ہنس کر برداشت کرتے

رہتے ہیں اور بعض وقت پھول کی چوٹ سے تڑپ جاتے ہیں بشرطیکہ پھول مارنے والا جنید ہو۔ کم بولتے ہیں مگر جب بولتے ہیں تو چھوٹے فقروں میں بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ وہ خیالی محل تعمیر نہیں کرتے بلکہ سچ مچ کا مکان بنا ڈالتے ہیں۔ وہ لباس میں شاعرانہ بے پروائی اور اپنی مشاطگی میں فنکارانہ بے احتیاطی برتتے ہیں لیکن یہ بے احتیاطی اور بے پروائی دوسرے معاملات میں بالکل نہیں ہے۔ فنکارانہ انا ان کے مزاج میں رچی ہوئی ہے اور بعض وقت یہ رچاؤ اس قدر گہرا ہو جاتا ہے کہ لوگ انہیں مغرور سمجھنے لگتے ہیں۔

چلتے ہمیشہ کندھا ڈال کر ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ فضا کا بوجھ گویا انہوں نے ہی سنبھال رکھا ہے ان کی چال کسی کڑی کمان کا دُور گرتا ہوا تیر ہے، اب جسم دُبلا ہے مگر دیکھنے کا، وہ ہمت کو تھکا دیتے ہیں، بیماری میں بھی دفتر جاتے ہیں۔ وہ کار دنیا کسے تمام نہ کرد کے قائل نہیں!!

محشر کی شاعری شخصی حسن و محبت کے جادو نہیں جگاتی بلکہ وہ آفاقی اور کائناتی حسن و محبت کی جھلکیاں دکھاتی ہے ان کی شاعری میں صرف دو دل نہیں دھڑکتے بلکہ پوری کائنات دھڑکتی ہے ان کی شاعری میں روایت کے ساتھ ساتھ روایت کا حسن نکھرا نکھرا دکھائی دیتا ہے اور کیوں نہ ہو روایت تو ماضی اور مستقبل کی درمیانی کڑی ہے روایت کے بغیر ارتقاء ممکن نہیں، قومیں اپنی روایت ہی سے پہچانی جاتی ہیں۔ مواصلات کی تیز رفتاری نے ہر چند پوری دنیا کو ایک خاندان میں بدل دیا ہے۔ لیکن اس خاندان کے باپ بیٹوں میں امتیاز رہنا ضروری ہے ادب میں یہ امتیاز اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ ادب قوموں کا تہذیبی ورثہ ہوتا ہے اور یہ ورثہ اپنی روایت ہی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادب کو لکیر کا فقیر ہونا چاہیئے اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ روایت کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں۔ پیرایۂ اظہار ادب کو نئے سے نئے رنگ دیتا ہے۔ یہ رنگ ذاتی اور اجتماعی عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ بڑا شاعر اپنے ذاتی تصوراتی نقشوں میں جب یہ رنگ

بھرتا ہے تو اس کا موقلم انہیں آفاقی بنا دیتا ہے "شہر نوا" سے ایسے ہی کچھ پسندیدہ نقشے آپ بھی دیکھیں۔

نہ جاؤ گھر کے شب افروز روزنوں پہ کہ لوگ
دیا مکان میں جلتا بھی چھوڑ جاتے ہیں

ذرۂ تہہ خاک اچھا کہ اپنی کسی ضو سے
سورج کی نگاہوں میں گنہگار نہ ٹھہرے

نہ جلوؤں کا نہ اندازہ نظر کا!
انہیں دیکھیں مگر کس فاصلے سے

قلبِ لالہ داغ آثار لبِ تبسّم آمادہ
کیا بُرا تھا رولیتا ایسے مسکرانے سے

کوئی غنچہ کھِلے چونک پڑتا ہوں میں
جیسے میری ہی جانب ہے روئے سخن

تلاشِ صبر کی حد ہے کہ اب سکون کیلئے
جہاں لٹا تھا سکون دل ادھر بھی جاتا ہے،

بج رہے ہیں جرس، بندھ رہا ہے سماں جارہا ہے بڑے کرّ سے کارواں
ایسے ہنگامۂ گرم میں کچھ کہوں ایک رہرو کی آواز کیا آئے گی!

بحرِ بیکراں کے لئے سفینہ درکار ہوتا ہے اور یہاں سفینے کے ساتھ ہمت بھی نہیں ہے وقت تھوڑا اور باتیں زیادہ، میں پہلی ہی بات دہرانی چاہتا ہوں، پان اور غزل۔ اصل میں دونوں ایک ہیں اور محشر بدایونی انہی دونوں سے عبارت ہیں وہ پان بہت کھاتے ہیں اور خوب، خوب غزلیں کہتے ہیں پان ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اور غزل ہماری تہذیب کی ترجمان اور نمائندہ، وہی غزل گو بڑا شاعر ہے جس کا تہذیبی ورثہ بڑا ہے۔

رائٹرز کلب کراچی کے ادبی اجلاس منعقدہ۔ ۱۹۶۹ء میں پڑھا گیا۔

صابر دہلوی مرحوم

دوسری جنگِ عظیم سے پہلے کا زمانہ امی جی کا زمانہ تھا۔ کساد بازی کم تھی، روپیہ کی قوتِ خرید زیادہ لوگ معمولی آمدنی میں بھی کھُل کھیل سکتے تھے، ہر طرف اطمینان اور سکون تھا، انگریز کے قانون کی گرفت مضبوط تھی اور عام آدمی بھی دلی طمانیت کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔

دلّی کی فضا بھی نہایت پر سکون تھی اور ظاہر ہے جب معاشرے میں کوئی ہلچل نہ ہو تو اندھے کو اندھیرے میں دور ہی کی سوجھتی ہے، دلّی میں، مرغ بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی غرض تمام بازیاں جو مسلمانوں کے زوال کی علامت سمجھی جاتی ہیں عروج پر تھیں اور اسی طرح ادبی محاذ بھی سرگرم تھا، چار ادبی ٹھکانے اس زمانے میں خاصے مشہور تھے: بیخود دہلوی کا ٹھکانہ، سائل دہلوی کا ٹھکانہ، آغا شاعر قزلباش کا ٹھکانہ اور پنڈت امرناتھ ساحر کا ٹھکانہ۔ اس کے علاوہ شہر میں چھوٹے بڑے اور بھی محاذ تھے، ان میں اکبر حیدری، حیدر دہلوی (جو دہلوی نہیں تھے) اور پروفیسر ظفر تاباں کے محاذ تھے۔ یہاں طالب علموں اور کم علم، شاعری سے شوق رکھنے والوں کا مجمع رہتا۔ استادوں میں بے خود دہلوی خاصے تنگ مزاج تھے ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے اور صرف اپنے آپ کو "جانشینِ داغ" کہتے اور سمجھتے تھے، آغا شاعر اور سائل دہلوی سے کبیدہ رہتے۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ لیکن ان کے شاگرد مشاعروں میں پالیاں جماتے۔ سائل دہلوی اور پنڈت امرناتھ ساحر ان ہنگاموں سے دور ہی رہتے۔ آغا شاعر قزلباش ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا سے بے نیاز بالکل ہی الگ تھلگ رہتے آغا شاعر کے شاگردوں میں بعض وقیع نام ملتے ہیں مثلاً آغا حشر کاشمیری (مشہور

ڈرامہ نویس) مہاراج بہادر برق دہلوی اور طالب دہلوی، سائل اور ساحر کے شاگردوں میں کوئی نامور نہیں ہوا۔

بے خود دہلوی میانہ قد، دہرے جسم، سانولہ رنگ اور کتابی چہرہ کے آدمی تھے چہرہ پر بھرواں کھچڑی ڈاڑھی سر پر ترکی شیر گولہ ٹوپی، جسم میں کرتہ اور شیروانی اور سیدھا پاجامہ ہاتھ میں ہر وقت ہزار دانے کی تسبیح، قلعہ میں گوروں کو اردو پڑھاتے تھے خالص دلی والوں کا لب ولہجہ، وہی چرب زبانی اور وہی طنطنہ بات ہوئی اور ضلع جگت پر اتر آئے، مٹیا محل میں رہتے تھے محلہ والے اُن سے ڈرتے بھی تھے اور ان کی عزت بھی کرتے تھے۔

سائل دہلوی کا حلیہ یہ تھا دراز قد، سُرخ وسفید رنگ، چہرہ پر امارت اور شرافتِ خاندانی کے واضح آثار، سفید بھرواں ڈاڑھی، سر پر مخملی چوگوشیہ ٹوپی، جسم میں انگرکھا، گفتگو میں نرمی اور شائستگی آواز میں سُریلا پن، چال ڈھال مہذب، وضع قطع میں ستھرا پن اور نفاست، گذر بسر خاندانی جائیداد اور لوہارو کے وظیفہ پر تھی شہر کے سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ دلی میں ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی، وہ پنڈت کے کوچہ کے قریب لال دروازہ میں رہتے تھے۔

آغا شاعر قزلباش میانہ قد سُرخ وسفید دہرے جسم کے آدمی تھے، وضع قطع سے بالکل دلی والے معلوم نہیں ہوتے تھے، کسی زمانے میں نہایت خوبصورت شخصیت کے مالک تھے، سر پر پشاوری کلاہ اور پگڑی، جسم میں ٹرکش کوٹ، ٹانگوں میں اُٹنگی شلوار، پاؤں میں عام طور پر بوٹ اور ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا۔ آواز میں نہایت غمگینی، لیکن مشاعرے میں غزل پڑھتے تو شیر کی طرح گرجتے اور تحت اللفظ ایسا پڑھتے کہ بڑے بڑے مترنم شعرا کی ہوا اکھڑ جاتی۔ مزاجاً نہایت منکسر، اور طبیعت میں ایک فقیرانہ لٹکا۔

بیخود کی شاعری، محاورہ اور زبان کی شاعری تھی، سائل شعر پھسپھسا کہتے تھے۔ پنڈت جی کی شاعری بے کیف ہوتی لیکن آغا شاعر کے یہاں زبان کے علاوہ فکر وخیال کی جادوگری بھی ہوتی اور میری ناچیز رائے میں داغ کی صحیح جانشینی انہی پر پھبتی تھی۔

پنڈت امرناتھ ساحر دُبلے پتلے، دراز قد اور گندمی رنگ کے مالک تھے، چہرہ

لمبا تھا اُس پر نہایت لمبی ڈاڑھی اتنی لمبی کہ آخر میں گرہ دینی پڑتی تھی۔ نہایت مہذب اور اسلامی ہندی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھے، دلّی کی قدیم روایت اور تمدّن کے امانت دار تھے، بازار سیتارام میں ان کا مکان تھا بالاخانہ پر ماہانہ مشاعرہ ہوتا اور دلّی کے تقریباً سبھی شعرائ اس میں شریک ہوتے۔

یہ تھی دلّی کی وہ ادبی فضا جس میں صابر دہلوی نے اپنی ادبی زندگی شروع کی ان کا نام محمد اسحٰق تھا اور وہ بلند شہر کے ایک گاؤں سُنبل کے رہنے والے تھے، پیشہ کے اعتبار سے سان گر تھے ان کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ چونکہ ساری عمر دلّی میں رہے اسی مناسبت سے اپنے آپ کو دہلوی لکھنے لگے۔ شعر سیدھا سادہ کہتے، محاکاتی رنگ زیادہ پسند تھا نہایت خوش گلو تھے، اپنی آواز کے جادو سے مشاعرہ جیت لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ دلّی کے مشاعروں میں جانے پہچانے جانے لگے اور دہلی کے قرب وجوار کے مشاعروں میں مدعو ہونے لگے پہلے وہ بیخود کے پھر سائل کے اور آخر میں آغا شاعر قزلباش کے شاگرد ہوئے۔

مولانا ماہر القادری سے ان کی پہلی ملاقات، علی گڑھ کی نمائش میں ہوئی اس زمانے میں مولانا ماہر القادری حیدر آباد میں قیام پذیر تھے۔ مگر مشاعرہ میں شرکت کے لئے علی گڑھ آئے ہوتے تھے۔ ماہر حیدر آباد سے بمبئی چلے گئے تھے، وہاں کی فلمی فضا انہیں راس نہ آئی اور وہ بمبئی سے دلّی آ گئے سنہ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی اور سرکارِ برطانیہ کا پروپیگنڈہ محاذ بھی نہایت سرگرم تھا۔ رسد اور نفری کے لئے جگہ جگہ "میں تو چھورے کو بھرتی کرائی آئی رے" کے نئے نئے پروگرام شروع کئے گئے انہی پروگراموں میں "جنگی مشاعرے" بھی تھے، ان مشاعروں میں تمام خوش گلو شعرائ مدعو ہوتے۔ انتظام علاقہ کا کمشنر یا ڈپٹی کمشنر کرتا اور شعرائ کو جیبیں بھر بھر کے معاوضہ ملتا۔ ان مشاعروں کا بڑا چرچا تھا اور تقریباً ہر ہفتہ کسی نہ کسی شہر میں کل ہند مشاعرہ ہوتا اور سامعین بھی ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے۔ ان مشاعروں میں شرکت کرنے والوں میں ماہر القادری بھی ہوتے، اور انہی مشاعروں میں صابر دہلوی، نخشب

جارچوی اور ماہر القادری کی دوستی شروع ہوئی اور یہ دوستی زیادہ گاڑھی ہوتی چلی گئی یہاں تک نخشب جارچوی جو میرٹھ میں رہتے تھے ہر روز میرٹھ سے دلّی آتے اور دوستوں میں وقت گذارتے صابر دہلوی تھے تو کم سواد مگر اہلِ علم اور شعرا کی محفلوں میں بیٹھنے اُٹھنے سے اُن میں وہ سلیقہ آگیا تھا جو شرفا کی محفلوں میں برتنے کے لئے ضروری ہوتا ہے، وہ خوش لباس اور خوش خوراک تھے۔ شام کو سجے بنے گھر سے نکلتے اور دادِ نظارہ دینے چاوڑی یا بازارِ حسن کا رُخ کرتے اور تماش بینی کے مزے لیتے، انہوں نے ماہر اور نخشب کو بھی ان راہوں پر لگانا چاہا مگر مولانا تھوڑی دیر ان کے ساتھ گئے اور واپس آگئے لیکن نخشب دور تک اور دیر تک اُن کے ہمسفر رہے۔

صابر دہلوی کی حضرت جگرؔ سے بھی دوستی تھی، وہ دلّی میں اکثر جگرؔ کی محفلوں میں پائے گئے اور خاصی بے تکلّفی سے پائے گئے۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد وہ بھی پاکستان آگئے اور کچھ دنوں لاہور میں قیام کے بعد وہ ملتان منتقل ہوگئے۔ یہاں خواجہ شفیع اور ماہر القادری کی شرکت میں انہوں نے آٹے کی ایک متروکہ مل اپنے نام کرالی تھی۔ خواجہ شفیع اور ماہر بعد میں اس شرکت سے دستبردار ہوگئے اور وہ بلا شرکت غیرے اس کے مالک بن گئے۔

صابر دہلوی دوستوں کے دوست تھے اور وہ احباب کی خوش دلی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے۔ کراچی اور لاہور سے آنے جانے والے شعرا ملتان میں ضرور ٹھیکی لیتے اور صابر ان کی تواضع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتے، محبت اور وفاداری ان کی سرشت تھی اور یہی سبب تھا کہ انھوں نے ایک جمیل برخوردار سے جو آجکل پاکستان کے نامور ادیب اور شاعر ہیں نہایت ٹوٹ کر محبت کی اور اُس محبت کو مرتے مرتے نبھایا۔ مختصر یہ کہ وہ عشق پیشہ اور نہایت رنگین مزاج تھے اور اپنے احباب کو بھی اسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ وہ ہمہ وقت شاعری، احباب اور سرمستیوں میں بسر کرنا پسند کرتے تھے۔

دلّی میں ان کے احباب میں ماہر القادری، نخشب جارچوی، فیض جھنجانوی، اور

سرخوش دہلوی (فرزند حضرت آغا شاعر قزلباش) خاص درجہ رکھتے تھے۔ ملتان میں عاصی کرنالی اُن کے احباب میں خاص قرب رکھتے تھے۔ احسان دانش بھی ان کے نہایت بے تکلّف دوستوں میں سے تھے ماہرالقادری سے ان کو زیادہ محبّت تھی اور وہ ہمیشہ ماہر کے لئے دیدہ و دل وا رکھتے اور ماہر کی دلجوئی اور مدارات میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔

اب نہ ماہرالقادری ہیں اور نہ صابر دہلوی صرف یادیں ہی یادیں ہیں اور بس ؎

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانی
ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

کچھ یادیں کچھ باتیں

عظیم شخصیتوں کو دیکھ لینا بھی عظمت ہے اور مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے برِّ صغیر کی بعض عظیم، ادبی اور علمی شخصیتوں کو دیکھا ہے اور بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان میں مہاراجہ سرکشن پرشاد، راجہ پرتاپ گیر، سر نظامت جنگ، فصاحت جنگ جلیل مانکپوری، نظم طباطبائی، مرزا ہادی رسوا، سیّد عبداللہ عمادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، مسعود علی محوی، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولوی عنایت اللہ، قاضی عبدالغفار، سیّد ظہور علی، الیاس برنی وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر نام آپ کے لئے اجنبی ہوں گے لیکن تہذیب و تمدّن ان کو نہ صرف یاد رکھیں گے بلکہ وہ ان ناموں کو ہمیشہ ادب و احترام سے لیں گے۔ یہ زمانہ حیدر آباد دکن کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور اسی بھرے پُرے حیدر آباد میں آج سے سینتالیس سال پہلے یعنی ۱۹۳۲ء میں حضرت فانی بدایونی مہاراجہ کشن پرشاد کے بلانے پر حیدر آباد آئے۔ فانی کے آنے سے شہر کی ادبی اور ثقافتی محفلوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک طرف مہاراجہ کشن پرشاد کی محفلیں تھیں۔ دوسری طرف ضامن کنتوری اور باغ بدایونی کے ماہانہ مشاعرے اور جامعہ عثمانیہ کی ادبی محفلیں ان دنوں جامعہ عثمانیہ مختلف عمارتوں میں تھی انہی میں سے ایک کوٹھی مسرت منزل تھی، یہاں مہاراجہ کی صدارت میں فانی کے اعزاز میں ایک مشاعرہ ہوا میں نے پہلی بار فانی کو اسی مشاعرے میں دیکھا اور سُنا دراز قد چھریرا بدن سانولا رنگ کشادہ پیشانی تیکھے نقوش پتلی مہری کا پاجامہ صوفیانہ رنگ کی شیروانی اور نرم ترکی ٹوپی چہرے پر متانت اور سنجیدگی کے آثار نمایاں، فانی کی شخصیت پُر وقار تھی۔

انہوں نے اس مشاعرے میں جو شعر پڑھے اُن میں سے بعض آج بھی حافظے میں محفوظ ہیں

مرکر ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں
ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

کیا جانئے کہ حشر ہو کیا صبحِ حشر کا
بیدار تیرے دیکھنے والے ہوئے تو ہیں

سرورِ عقل و غمِ عشق کے دو راہے پر!
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تو نے

تو دشنہ و پہلو میں حائل نظر آتا ہے
جیتے ہیں کہ مرجانا مشکل نظر آتا ہے

ایک تو فانی کا منفرد رنگِ سخن اُس پر اُن کا نہایت درد انگیز ترنم میرے دل پر بڑا اثر ہوا اور میں دوسرے ہی دن حیرت بدایونی کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر روز کا حاضر باش ہو گیا۔

فانی حیدر آباد آئے تو صلح سرائے میں مقیم ہوئے پھر سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ سرکاری مکان ملا تو اس میں منتقل ہو گئے۔ اس مکان کے سامنے میدان تھا شام کو چھڑکاؤ کر کے کرسیاں ڈال دی جاتیں اور عصر کے وقت سے فانی کے احباب اور قدردان آنے شروع ہوتے، تقریباً روز کے آنے والوں میں یاس یگانہ، حکیم آزاد انصاری، نواب نثار یار جنگ مزاج، نواب تراب یار جنگ سعید، ہوش بلگرامی، جوش ملیح آبادی، حیرت بدایونی، علی اختر، نجم آفندی، شاہد صدیقی، ماہر القادری اور حرماں خیر آبادی، یہ محفلیں شام کے جھٹپٹے میں شروع ہوتیں اور رات بھیگنے تک جاری رہتیں۔ انہی محفلوں میں ادب اور ثقافت نے بہت سے مورچے لگائے انہی محفلوں میں معاصرانہ چشمکوں کی کوکھ سے بعض تاریخی واقعات پیدا ہوئے، انہی محفلوں میں غالب کی بام شہرت پر کمندیں ڈالی گئیں انہی مجلسوں میں نظیر اکبر آبادی کی عوامی شاعری سے ریچھ کا بچہ برآمد کیا گیا۔ انہی محفلوں میں جوش اور علی اختر کی شاعری کے قد ناپے گئے

اور انہی مجلسوں میں بہت سے ادب پاروں کی جراحی ہوئی اور نہ معلوم کتنے نشتر توڑے گئے غرض یہ محفلیں میرے لئے بڑی تربیت گاہ ثابت ہوئیں اور آج بھی ان کے نقش میرے لوحِ ذہن پر گہرے ہیں ؎

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

فانی نہایت سنجیدہ مزاج تھے لیکن خشک نہیں تھے۔ ان کی شرارتیں بھی ان کی شاعری کی طرح "دقیق" ہوتیں وہ اپنی شرارت سے آدمی کو مخمصے میں ڈال دیتے اور وہ پٹتے پٹتے بچتا۔ حرماں خیر آبادی "سماعی علم" کے عالم تھے۔ کسی سے کوئی مسئلہ یا کوئی نئی بات سنتے اور اسے اپنے نام سے دوسروں کے سامنے پیش کرتے۔ ۱۹۳۵ء میں جگر مراد آبادی پہلی بار حیدر آباد آئے تو جگہ جگہ مشاعروں اور دعوتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ نواب بہادر یار جنگ کی حویلی میں مشاعرہ تھا سبھی معزز شعرا مع جگر کے موجود تھے۔ ماہر القادری غزل پڑھ رہے تھے جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

سرد ہو گیا شائد سوزِ قلب پروانہ
آج شام ہی سے کیوں شمع جھلملاتی ہے

تو فانی نے کہا مصرع یوں ہونا چاہیئے۔

آج شام ہی سے کیوں شمع ٹمٹماتی ہے

شرارت کے وقت فانی کے چہرے پر ایک خاص تاثر آجاتا تھا اور اسے صرف وہی سمجھتے جو ان سے زیادہ قریب تھے حرماں فقرہ لے اُڑے اور سرِ مشاعرہ ماہر کو ٹوکا "شمع ٹمٹماتی ہے" پڑھیئے۔ ماہر شش و پنج میں پڑ گئے۔ ادھر فانی کے چہرہ پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔

حرماں خیر آبادی جس گھر میں مقیم تھے وہاں انہیں شاید ایک لوٹے کی ضرورت تھی، یہ بات کسی طرح فانی کو معلوم ہو گئی فوراً کیرم کے ایک ٹورنامنٹ کا اہتمام کیا گیا اور میچ اس طرح کرائے گئے کہ آخر میں حرماں جیت گئے اور پھر ایک تقریب ہوئی۔ فانی

نے دعوت کی اور حیرت بدایونی نے قصیدہ پڑھا۔۔ "شیرِ نیستاں لوٹا" "مردِ میدان لوٹا" اور "حرماں لوٹا" اور کپ کی بجائے حرماں کو ایک لوٹا پیش کیا گیا۔

میرے ایک دوست حکیم آغا جان عیشؔ کے پوتے ناصر سعید جان دلّی سے حیدر آباد آئے۔ میں انہیں لے کر فانیؔ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تعارف کے بعد فانیؔ نے ان کے شعری مذاق کے متعلق سوالات کئے اور ان سے کچھ شعر سنانے کو کہا، وہ شاعر نہیں تھے۔ لیکن سینکڑوں شعر انہیں یاد تھے انہوں نے شعر سنانے شروع کئے اور کچھ شعر فانیؔ کے بھی پڑھے، فانیؔ خفا ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ کو میرے شعر مجھی کو نہیں سنانے چاہیئے تھے۔ دوسرے روز فانیؔ نے ان کی پر تکلّف دعوت کی۔ فانیؔ متوسط کھاتے پیتے گھرانے کے فرد تھے۔ ان کے والد کوتوال تھے اور چھوٹی موٹی زمینداری کے مالک تھے مگر اپنی افتاد طبع کی وجہ سے سب کچھ کھو بیٹھے۔ ان کی ناکام زندگی کا سبب ان کی آرام پسندی اور سہل انگاری بھی تھی۔ وہ زندگی کے مسائل حل کرنے میں بُری طرح ناکام رہے۔ ان حالات کے باوجود انہوں نے اپنی وضع اور خودداری کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ نشر گاہ حیدر آباد انہیں اپنا کلام نشر کرنے کی دعوت دیتا تو وہ ٹیکسی میں جاتے اور پروگرام ختم ہوتے تک ٹیکسی کھڑی رکھتے۔ ریڈیو والے انہیں چیک کی بجائے نقد معاوضہ ادا کرتے تاکہ انہیں فوراً ضرورتوں کے پورا کرنے میں پریشانی نہ ہو۔ اس رقم کا بڑا حصّہ ٹیکسی والا لے جاتا اور باقی رقم ان کی کشادہ جیب کو ہضم نہ ہوتی۔

فانیؔ کی بیگم کا انتقال ہوا تو وہ تنگدست تھے اور آخری رسوم کے لئے ان کے مالی حالات اور وسائل سقیم تھے۔ فانیؔ کے ایک قدر داں دوست نواب دوست محمد خان نے کچھ رقم بھیجی فانیؔ خفا ہو گئے یہ رقم واپس کر دی اور کہلا بھیجا کہ آپ مجھے ایسے وقت آزماتے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو سے عرفانیاتِ فانیؔ تازہ تازہ چھپ کر آئی تھی۔ اس کی جلدیں احباب نے خریدیں اور اس طرح فانیؔ کی خودداری کا اور ان کی بیگم کا پردہ رہ گیا۔

اور شاعروں کی طرح فانیؔ کا اوڑھنا بچھونا شاعری نہ تھا۔ ان کی صحبت میں یہ

اندازہ لگانا مشکل ہوتا کہ آپ ایک عظیم شاعر کے پاس بیٹھے ہیں۔ ان کی محفلوں میں عام طور پر شاعری کا چرچا کم ہوتا اور زندگی کے دوسرے مسائل گفتگو میں رہتے وہ مشاعروں اور بعض خاص قسم کے شاعروں سے بہت گھبراتے وہ جب تازہ شعر کہتے تو پوچھتے کہو، کچھ کہا ہے۔ میں سمجھ جاتا اور کوئی پرانی غزل نئی کر کے سُنا دیتا اور پھر وہ اپنے شعر سُناتے۔

فانیؔ مجھ سے محبت کرتے تھے اور اپنی اولاد کی طرح مجھے سمجھتے، جس روز میں نہ جاتا خود میرے یہاں تشریف لے آتے اور میری غیر حاضری کی معقول وجہ معلوم کئے بغیر مطمئن نہ ہوتے۔ میں دلّی جاتا تو خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا۔ افسوس ۴۷ء کے ہنگاموں میں یہ خطوط ضائع ہو گئے۔

اس تحریر کا مختصر کاغذی پیراہن فانیؔ کی قد آور شخصیت کے لئے بہت چھوٹا ہے مجھے صرف یہی کہنے دیجئے کہ عظیم لوگوں کو دیکھ لینا بھی عظمت ہے اور مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے فانیؔ جیسی عظیم شخصیت کو دیکھا ہے اور بہت قریب سے دیکھا ہے۔

جب میں حیدر آباد میں تھا

میں تیرہ سال کا تھا جب حیدر آباد پہنچا یہ بات سنہ ۱۹۲۵ء کی ہے، تیرہ سال کی عمر بڑی عجیب ہوتی ہے ایک طرف لڑکپن کی آخری منزلیں ہوتی ہیں اور دوسری طرف جوانی کے ابتدائی مراحل، لڑکپن اور جوانی کا یہ ملا جلا دور آدمی کو عجیب عجیب سنہرے خواب دکھاتا ہے، اس کے احساسات ناپختگی میں پختہ اور اس کی عقل پختگی میں ناپختہ ہوتی ہے۔ فطرت نے مجھے ایک حساس دل بخشا تھا، جو آگے چل کر میری شاعری کی خشت اوّل ثابت ہوا مگر یہ خشتِ اوّل کج نہاد نہیں رہی بلکہ وہاں کے ادبی اور شعری ماحول نے اسے میری تعمیری بنیاد میں اس طرح رکھا کہ میری روح کی ساری عمارت آج تک اسی پر کھڑی ہے اور پینسٹھ سال سے بہت سے زلزلوں اور موسموں کی تخریبی قوتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں۔

تیرہ سال کی عمر بڑی عجیب ہوتی ہے ریل کا طویل سفر جو کئی تمدّنوں سے گذرتا ہوا مجھے حیدر آباد کے مخصوص معاشرے تک لے گیا۔ میرے لئے بڑا دلچسپ تھا۔ تمدّنوں کی یہ تبدیلی گوالیار کے بعد ہی سے شروع ہو گئی، نہ صرف تمدّن بدلتا گیا بلکہ جغرافیائی ماحول بھی بدلتا گیا۔ میدان، اونچے نیچے پہاڑوں میں، ہرے بھرے کھیت، جنگلوں اور لق و دق صحراؤں میں، چشمے اور آہستہ خرام دریا، تیز رَو برساتی ندی نالوں میں تبدیل ہوتے گئے، اردو کی جگہ مرہٹی، گجراتی، کنڑی اور تلنگی نے لے لی، چُنے ہوئے کُرتوں اور چست پاجاموں کی جگہ مرہٹی لنگیاں اور ساڑیاں نظر آنے لگیں، کھانوں میں بھی نمایاں فرق محسوس ہوا، سالن روٹی کی جگہ خشکہ چٹنیاں اور سبزیاں ترکاریاں کھانے کو ملیں۔ غرض یہ فرق میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا مگر بڑا دلچسپ۔ میں ایسے تمدّنوں سے بھی گذرا جہاں مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں رام لچھمن کے زمانے میں آ گیا ہوں اور یہ محسوسات مجھ پر بڑے گہرے نقوش چھوڑ گئے جو آج بھی تازہ ہیں۔

میں منماڑ ہوتا ہوا چھوٹی لائن سے اورنگ آباد سے گذرتا حیدر آباد پہنچا یہ واقعہ

۱۹۳۵ء کا ہے لیکن کل کی بات معلوم ہوتا ہے، ماضی ہمیشہ خوبصورت ہوتا ہے اور خوبصورت ماضی ہو تو خوبصورت تر! حیدر آباد کا شہر بڑے بڑے تالابوں اور اونچی نیچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا نہایت خوبصورت شہر ہے۔ ریاست حیدر آباد کی زمین بھی اونچی نیچی ہے، کہیں میدان، کہیں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، کہیں سبزہ، کہیں زمین بالکل بنجر اور غیر آباد۔ برساتی ندی نالوں کی اسی سرزمین نے تاریخ کے سینکڑوں بہاؤ دیکھے ہیں۔ بودھوں کا تقدس، راجہ نل کا جاہ و جلال، رام اور ستیا باس باس، ایرانی اور عرب تاجروں کی آمد قطب شاہی، بہمنی اور برید شاہی سلطنتوں کا عروج و زوال، مغلوں کی تگ و تاز، انگریزوں کی فریب کاریاں غرض مختلف تہذیبوں کے سینکڑوں دھارے اس سرزمین میں خشک ہو چکے ہیں۔

میں جس تمدن سے گیا تھا اس میں اور یہاں کے تمدن میں زمین آسمان کا فرق تھا، یہاں کے لوگ نہایت مہذب اور شائستہ تھے، مسلمانوں اور ہندوؤں کا عام لباس شیروانی اور پاجامہ تھا بعض ہندو بھی سُرخ ترکی ٹوپی جو کرسٹی کہلاتی ہے پہنتے اور بسا اوقات ہندو مسلمان کا فرق مشکل ہو جاتا، رعایا عام طور پر خوشحال اور مطمئن تھی، ہندو مسلمان شیر و شکر تھے۔ یہاں کی تعلیمی اور دفتری زبان اردو تھی۔ دفتروں کی کارکردگی کا طریقہ نہایت عمدہ تھا بلکہ میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ برطانوی ہند کے دفاتر سے بہتر تھا، سرکار نظام کی اپنی پولیس، اپنی ریل، ڈاک اور تار کا اپنا نظام، اور اپنا سکہ رائج تھا جسے حالی کہتے تھے۔

نشریات کا محکمہ بھی اپنا تھا۔ شروع شروع میں نشریات کا سلسلہ محبوب علی صاحب نے نجی طور پر شروع کیا تھا بعد میں یہ انتظام سرکار نظام نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس نشرگاہ کے غالباً پہلے اناؤنسر ظفر الحسن تھے۔ پھر سرونگر میں ایک خوبصورت ریڈیو اسٹیشن تعمیر ہوا تھا اس نشرگاہ سے مجھے بھی اپنا کلام نشر کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ مگر یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کے بعد کا ہے۔

حیدر آباد کا تمدن دیکھ کر اُس تہذیب کا ضرور اندازہ ہوتا تھا جو انگریزی قبضہ کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان سے ختم ہو گئی اور حیدر آباد کا نظام حکومت دیکھ کر یہ

یقین کرنے کو کسی طرح جی نہیں چاہتا کہ مسلمان حکومت کرنے کے اہل نہیں تھے۔

میرا قیام نرائن گوڑے میں ہوا جو بالکل نیا نیا آباد ہوا تھا کیونکہ اس وقت وہاں بمشکل بیس پچیس مکان ہوں گے۔ یہاں میرے نانا مولوی عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ ایک بڑے سے بنگلے میں رہتے تھے مولوی صاحب میری والدہ کے سگے ماموں تھے، اتنے بڑے بنگلے میں، صرف تین نفوس مولوی عنایت اللہ صاحب، میں، اور ایک بیرا، اس صاف ستھرے بنگلے میں ہم تینوں کی حیثیت کچھ باپ بیٹا اور روح القدس جیسی تھی، اس خاموش اور پُر سکون فضا کا تقدس بالکل ایسا ہی ہو جاتا۔ مولوی عنایت اللہ صاحب تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے وہ اپنے کمرے سے بہت کم برآمد ہوتے، ان کا خوبصورت نورانی چہرہ، بسا اوقات بالکل الوہی معلوم ہوتا، بیرے کے صاف شفاف سفید کپڑے میرے سامنے فرشتوں کا سا ہیولا پیش کرتے اور میں اکثر الہامی کیفیات میں ڈوب جاتا۔

مولوی صاحب کے کمرے میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہ تھی، گھر میں وہ ہمہ وقت کُتب بینی یا ترجمہ میں مصروف رہتے ان کی عادت تھی کہ وہ صبح کا ناشتہ چار ساڑھے چار بجے کر لیتے، ناشتے کے سوا دونوں وقت کے کھانے اور شام کی چائے پر میری حاضری نہایت ضروری تھی پھر اگر دن بھر ملاقات نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مولوی صاحب بڑے معصوم آدمی تھے، وہ کم سخن تھے اور تہذیب و شائستگی کا مجسمّہ تھے۔ ان کے رات دن باقاعدہ اور با اصول گذرتے، انہیں غصّہ بالکل نہیں آتا تھا۔ ان کے گِنے چُنے دوست تھے۔ انہوں نے پہلی تاریخ کو کبھی تنخواہ وصول نہیں کی۔ ساری تنخواہ دفتر کے محاسب کے پاس جمع رہتی ضرورت کے مطابق پرچی بھیج کر وہ روپیہ منگا لیتے، چنانچہ جب وہ ریٹائر ہوئے تو محاسب نے کوئی چالیس ہزار روپے لاکر دیئے، وہ پچھلا قرض ادا نہ کرنے والوں کو بھی بار بار قرض دے دیتے تھے اور کبھی تقاضا نہیں کرتے تھے وہ اکثر کتاب میں ترک کے طور پر نوٹ لکھ دیا کرتے یا تو عادتاً یا میری ہنگامی ضرورتوں کے پیشِ نظر۔

عنایت اللہ صاحب خشک آدمی نہیں تھے، ایک دفعہ میں نے پوچھا نانا ابّا آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔ کہنے لگے میاں ایک جگہ ابا نے (یعنی شمس العلماء

مولوی ذکاءاللہ صاحب نے) ہمارا رشتہ بھیجا تھا وہاں سے انکار آگیا تو ہم نے سمجھا کہ ہم میں کوئی کمی ہے جو انکار ہوا ہے، ان کا یہ دلچسپ مشغلہ تھا کہ وہ مجھ سے کھانے پر کہتے اچھا میاں مسعود ذرا چڑیوں کے نام تو لو دیکھیں تمہیں کتنے نام یاد ہیں، میں کہتا نانا ابا یہ بھی کوئی مشکل بات ہے مگر جب نام لینے شروع کرتا تو معلوم ہوتا کہ دو چار ناموں کے بعد نام لینے بہت مشکل ہیں۔ اسی طرح کبھی درختوں کے نام پوچھتے اور مجھے محسوس ہوتا کہ املی، جامن، آم اور نیم کے بعد درخت ہی نہیں ہوتے، کبھی وہ رشتے پوچھتے غرض اسی طرح کی دلچسپ باتوں میں کئی کئی گھنٹے گذر جاتے، وہ اُس زمانے میں کہا کرتے تھے کہ لوگ عام طور پر اردو غلط لکھتے اور بولتے ہیں، اس زمانے کے متعلق ان کی نہ جانے کیا رائے ہوتی۔ یہ تھا وہ گھر اور اس کا ماحول جہاں میں جاکر ٹھہرا۔

مجھے دارالعلوم میں آٹھویں جماعت میں داخلہ ملا، اس وقت ہمارے ہیڈ ماسٹر ظہور علی صاحب تھے۔ بھرواں خوبصورت کتابی چہرہ، سُرخ سفید رنگ، درمیانہ قد، گداز جسم، جھالردار سفید ڈاڑھی اور اس وضع قطع پر وہ نہایت اعلیٰ سوٹ پہنتے تھے وہ ہمیشہ پیدل چلتے اور بہت تیز چلتے تھے۔ ان کے ہزاروں شاگرد تھے جن میں سے بعض اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ظہور علی صاحب بڑے نامور استاد تھے اور علمی ادبی حلقوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ دارالعلوم چارکماں میں تھا۔ میں ریذیڈنسی سے ہوتا ہوا موسیٰ ندی کے کنارے کنارے افضل گنج کے پُل سے گذرتا اسکول آتا جاتا تھا، دارالعلوم ہندوستان کے قدیم ترین اسکولوں میں سے تھا اس کی قدامت کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ مہاراجہ کشن پرشاد نے بھی اسی اسکول میں تعلیم پائی تھی یہ بات خود مہاراجہ نے مجھ سے فرمائی تھی۔

حیدرآباد کا یہ زمانہ انتہائی عروج کا زمانہ تھا، عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو چکی تھی اور ہندوستان بھر کے اہلِ علم یہاں جمع تھے، مجھے جن لوگوں کے دیکھنے کا شرف حاصل رہا ہے ان میں مرزا ہادی رُسوا، نظم طباطبائی، وحیدالدین سلیم، عظمت اللہ خاں اور مولانا مناظر احسن گیلانی جیسی ہستیاں تھیں، عثمانیہ یونیورسٹی اس زمانے میں مسرت منزل، فرحت منزل، اور غالباً نظامت منزل میں تھی۔ مولوی عنایت اللہ صاحب چونکہ ناظم دارالترجمہ تھے، اس

لئے یہ حضرات بھی ان کے پاس آتے جاتے تھے۔

مرزا ہادی رُسوا یونیورسٹی میں غالباً نفسیات پڑھاتے تھے، مرزا صاحب گداز جسم اور میانہ قد کے آدمی تھے وہ چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے، پان کی پیک کے دھبّے اکثر ان کی شیروانی پر نظر آتے۔ وہ خاصے معمّر ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ پچاس پچپن کے معلوم ہوتے، مرزا صاحب واجد علی شاہ کے دربار میں رہے تھے۔ مال گزاری کے سامنے بنواڑی کی دکان کے اوپر والے کوٹھے میں رہتے تھے اور ان کا انتقال غالباً ۱۹۳۵ء میں ہوا۔

نظم طباطبائی بھاری جسم اور چوڑی ہڈی کے آدمی تھے، وہ بہت اونچا سنتے تھے، میں نے جب انہیں دیکھا ہے تو وہ اسّی سے متجاوز تھے، ایک مشاعرہ ان کی صدارت میں فرحت منزل میں ہوا تھا مجھے شاعری کا شوق بچپن سے تھا میں بھی اس مشاعرے کے سننے والوں میں شریک تھا۔ یونیورسٹی کے جن طالب علموں نے اس مشاعرے میں شعر سنائے ان میں سے دو ایک نام مجھے آج بھی یاد ہیں بدرالدین بدر، بدر شکیب، عبدالقیوم باقی اور زیبا ردولوی، مشاعرے کے آخر میں مولانا نظم طباطبائی نے اپنا کلام سنانے سے پہلے انیس کی غزلوں کے کچھ شعر سنائے تھے ایک شعر آپ بھی سنیئے ؎

خار کو گل کے قریں دیکھ کے میں یہ سمجھا
چیختے چیختے بلبل کی زباں سوکھ گئی!

نظم طباطبائی بھی واجد علی شاہ کے دربار کے آدمی تھے بلکہ انہوں نے شہزادوں کو عربی پڑھائی تھی وہ مرزا ہادی رسوا سے عمر میں بڑے تھے۔ یہ مشاعرہ شاید ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا۔

مولانا وحید الدین سلیم کا رہن سہن بڑا گندہ تھا، گھر کی دیواروں اور فرش پر جگہ جگہ گندگی اور پان کی پیک کے دھبّے، ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، چیکٹ بچھونے، غرض ان کے گھر پر ایک طرح کی نحوست برستی تھی۔

غالباً ۱۹۲۹ء میں جوش ملیح آبادی بھی حیدرآباد آچکے تھے، اور ۱۹۳۲ء میں فانی بدایونی بھی حیدرآباد آگئے تھے فانی دوسری دفعہ حیدرآباد آئے تھے وہ پہلی دفعہ ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد گئے تھے۔ جوش ملیح آبادی دارالترجمہ میں ناظر ادبی کی خدمت پر مامور ہوئے، اُن کا قیام اُس زمانے میں نرائن گوڑے میں میرے گھر کے قریب تھا، شام کو ان کے

یہاں احباب کا مجمع ہوتا اور شاعری اور سرمستی کے دور ہوتے اور خوب لطف رہتا، جوشؔ کے یہاں علی اختر، حیرتؔ بدایونی اور اعجاز الحق قدوسی روز کے آنے والوں میں تھے، آزاد انصاری اور ہوشؔ بلگرامی بھی آتے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ یونیورسٹی کے طلبا اور شہر کے رہنے والے بعض دلدادگانِ شعر بھی جمع ہو جاتے۔

فانیؔ بدایونی حیدر آباد آئے تو پہلے نام پلّی اسٹیشن کے پاس جوزف ہوٹل میں پھر "صلح سرائے" میں مقیم ہوئے، اور پھر ملے پلّی کے ایک سرکاری کوارٹر میں منتقل ہو گئے اور اپنی وفات تک یہیں رہے۔ فانیؔ کی آمد پر بھی ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ مہاراجہ کی صدارت میں نظامت منزل میں ہوا، اِسی مشاعرے میں میں نے پہلی بار فانیؔ کو دیکھا اور سُنا، ان کے اس مشاعرے کے دو شعر مجھے اب تک یاد ہیں ؎

گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر
تجلّیات کے دریا بہا دیئے تُو نے

سرورِ عقل و غمِ عشق کے ڈُور لہے پر
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تُو نے

فانیؔ کے شعر پڑھنے کا انداز بڑا پُر تاثیر اور درد انگیز تھا وہ بڑی غمگین لے میں شعر پڑھتے مجھ پر ان کا بڑا گہرا اثر ہوا اور میں دوسرے ہی روز اُن سے ملنے جا پہنچا وہ نہایت محبت اور شفقت سے پیش آئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ان کے یہاں تقریباً روز جانے لگا اور ان کو بھی مجھ سے ایک طرح کا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا میں جس روز نہ جاتا، دوسرے روز میری غیر حاضری کی وجہ پوچھتے۔ فانیؔ اب ملے پلّی کے مکان میں منتقل ہو چکے تھے، شام کو ان کے گھر کے سامنے والے میدان میں دس بارہ کرسیاں پڑ جاتیں اور احباب اور شعرا کا اچھا خاصا مجمع ہو جاتا۔ یہ محفلیں رات کے دس گیارہ بجے تک جمی رہتیں، یہاں حکیم آزاد انصاری، مرزا یاس یگانہ، جوشؔ ملیح آبادی، حیرتؔ بدایونی، اجلالؔ لکھنوی، تراب یار جنگ سعید، نثار یار جنگ، ماہرؔ القادری، حرماں خیر آبادی، عبد الہادی اور اسمٰعیل مینائی تسنیم وغیرہ جمع رہتے۔ ان محفلوں میں شعر و شاعری سے لے کر سیاسیات تک کوئی ایسا موضوع نہ تھا جو زیرِ بحث نہ آتا۔ انہی محفلوں میں غالبؔ کے طرفداروں کی موجودگی میں غالبؔ کو اصلاحیں دی گئیں، انہی صحبتوں میں نظیرؔ اکبر آبادی

کو عوامی شاعر کہہ کر ایک تحریک کی صورت دی گئی اور انہی مجلسوں میں میر اور غالب کی شاعری میں گلہری اور ریچھ کا بچہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، انہی انجمن آرائیوں میں جوش اور علی اختر کے شعری موازنے کی بنیاد رکھی گئی، اور انہی محفلوں میں رشک کو حسد میں بدلتے دیکھا گیا غرض یہ پُرلطف صحبتیں اب نقش ونگارِ طاقِ نسیاں ہو چکی ہیں۔

حیدر آباد کے اس سنہرے دور میں ایک طرف تو عثمانیہ یونیورسٹی کی علمی اور ادبی فضا تھی اور دوسری طرف شہر کے ادیبوں اور شاعروں کا ماحول اور مہاراجہ کشن پرشاد کی ادبی محفلیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں جو لوگ نمایاں تھے ان میں سید وزیر حسن، رضی الدین صدیقی، اکبر وفا قانی، بدر الدین بدر، ڈاکٹر منور علی، عبد القیوم باقی، جی ایم خان، بدر شکیب اور زیبا ردولوی اور بعد کے لوگوں میں میر حسن، مخدوم محی الدین، نور الہدیٰ، شعیب حزیں، مرزا ظفر الحسن، سکندر علی وجد، غلام علی، صمد رضوی ساز اور صاحبزادہ میکش وغیرہ کے نام مجھے یاد ہیں۔ یونیورسٹی کے استادوں میں ڈاکٹر سید سجاد، ڈاکٹر نظام الدین، ڈاکٹر یوسف حسینی خاں، الیاس برنی، مولوی عبد الحق (بابائے اُردو) ہارون خاں شیروانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر پروفیسر عبد القادر سروری وغیرہ تھے۔

نظام کالج اُس زمانے میں ڈگری کالج نہیں تھا یہاں بھی بعض عمدہ شعری صحبتیں ہوئیں یہاں کا انگریز پرنسپل ان مشاعروں میں چُست پاجامہ اور کالی شیروانی پہن کر شریک ہوتا۔ آغا حیدر حسن اسی کالج میں استاد تھے۔

شہر کے لوگوں میں یہ لوگ قابلِ ذکر ہیں۔ امجد حیدر آبادی، جلیل مانکپوری (اُستادِ نظام) ضامن کنتوری، صفی اورنگ آبادی، علی اختر، قاضی عبد الغفار، مرزا فرحت اللہ بیگ، غلام یزدانی، آغا حیدر حسن، مولانا حسام الدین فاضل، سالار جنگ، سر نظامت جنگ، سر امین جنگ، راجہ پرتاپ گیر، اختر یار جنگ، بہادر یار جنگ، سردار نواز جنگ، اصغر یار جنگ، محبوب علی، تراب علی، مولانا مجیب احمد تمنائی، سید علی منظور، ڈاکٹر اشرف الحق، مولانا عبد القدیر، نواب دوست محمد خاں، باغ علی گڑھی اور ہاشم علی خان، ضامن کنتوری اور باغ کے یہاں ماہانہ مشاعرے بڑی دھوم دھام سے ہوتے اور شہر

کے تمام اچھے شعراء ان میں شریک ہوتے اور دادِ سخن دیتے۔

مہاراجہ کی ادبی صحبتوں میں عزیز یار جنگ، ضیا یار جنگ، شہید یار جنگ، حیرت بدایونی، بیگم لکھنوی، ڈاکٹر اشرف الحق، نجار، برتر لکھنوی، مسعود علی محوی، مولانا عبداللہ عمادی، فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، ثاقب بدایونی اور ماہر القادری روز کے آنے جانے والوں میں تھے۔ مہاراجہ کی ذات اسلامی ہندی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھی، جیسے زمزمی میں گنگا جل، داد و دہش میں حاتم کی سی شان، بے نیازی اور استغنا میں درویشوں کی سی ادا، لحاظ اور مروّت میں دوستوں اور عزیزوں جیسا انداز، شان اور دبدبے میں بادشاہوں کا سا طمطراق، تہذیب اور شائستگی میں پرانی قدروں کا رکھ رکھاؤ، مہاراجہ کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ یہ جس مٹی کے مشام ہیں وہ مٹی نہیں اکسیر تھی، مہاراجہ کا انتقال غالباً ۱۹۳۹ء میں ہوا۔

اُسی زمانے میں نواب معظم جاہ شجیع کو بھی شاعری کا شوق ہوا اور وہاں بھی شعر و سخن کی محفلیں رت جگوں میں نکھرتیں اور خوابِ سحر میں ڈوب جاتیں، یہاں کے مخصوص شاعر نجم آفندی اور شاہد صدیقی تھے، نواب معظم جاہ فانی کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کو بھی ان صحبتوں میں روز یاد کر لیتے تھے، مگر فانی کو اس بڑھاپے میں متواتر راتوں کا جاگنا راس نہ آیا اور ان کی جان کا روگ ہو گیا اور ان کی صحت خاصی خراب رہنے لگی۔ نواب معظم جاہ روز کے جانے والوں کے علاوہ کبھی کبھی علی اختر، آزاد انصاری اور ماہر القادری کو بھی بلا لیتے تھے۔

۱۹۳۵ء میں جگر مراد آبادی حیدر آباد گئے اور فانی کے مہمان ہوئے، جگر کا یہ زمانہ شعر و سرمستی کے شباب کا زمانہ تھا، پورے شہر میں مشاعروں کی دھوم مچ گئی، کالجوں میں، یونیورسٹی میں احباب اور قدردانوں کے یہاں غرض ہر جگہ مشاعرہ بپا ہو گیا، نواب بہادر یار جنگ کی ڈیوڑھی میں بھی ایک مشاعرہ ہوا اور اس میں فانی اور جگر دونوں شریک ہوئے۔ میں نے ایک مشاعرہ راجہ پرتاب گیر کی کوٹھی میں کیا اس میں مہاراجہ بھی شریک ہوئے، یہ مشاعرہ مولوی عبدالحق کی صدارت میں ہوا اور شاعروں میں صرف پانچ شاعر تھے، فانی، جگر، شام اکبر آبادی (فانی کے ایک مہمان ہندو دوست)

سکندر علی وجد اور میں، اس مشاعرے کے لطف کا اندازہ اس سے کیجئے کہ فانی نے کہا کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا مشاعرہ نہیں دیکھا۔ سننے والے صرف دو سو حضرات تھے۔ شعرائی کی اس مختصر فہرست کے باوجود یہ مشاعرہ رات کو دو بجے ختم ہوا ہر شاعر نے تقریباً دس دس غزلیں سنائیں اور پھر فانی اور جگر سے بے شمار غزلیں سنیں۔ جگر کے اعزاز میں ایک مشاعرہ فوقانیہ مدارس (ہائی اسکولوں) کی انجمنِ اساتذہ کی طرف سے مہاراجہ کی صدارت میں ہوا یہ مشاعرہ بڑے معرکے کا مشاعرہ تھا اس میں جگر کو بہت داد ملی تھی ان کے بعد فانی کا نمبر تھا، میں حیران تھا کہ اب کیا ظہور میں آنے والا ہے مگر اس مطلع ہی پر داد سے چھتیں اُڑ گئیں ؎

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

اب یونیورسٹی اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو چکی تھی اور یومِ جامعہ کے سلسلے میں وہاں بھی بڑے بڑے علمی اور ادبی اجتماع اور مشاعرے ہوتے انہی میں سے ایک مشاعرے میں حفیظ جالندھری بھی حیدر آباد گئے یہ ان کا پہلا پھیرا تھا۔ حفیظ کی وجہ سے بھی شہر میں بہت سی دعوتیں اور مشاعرے ہوئے ایک مشاعرہ ہاشم علی خان کے یہاں ہوا، اس میں مرزا فرحت اللہ بیگ، فانی بدایونی، حیرت بدایونی، اور بہادر یار جنگ شریک ہوئے، حفیظ نے بہت سی نظمیں سنائیں اور آخر میں فانی کے کلام پر یہ عمدہ دعوت اور مشاعرہ ختم ہوا، قاضی عبدالغفار مدیر پیام نے بھی حفیظ کو چائے پر بلایا تھا اور اسی چائے پر سبطِ حسن سے میری وہ ملاقات ہوئی جس کی تجدید ان سے کراچی میں کرنی پڑی۔ خیر!!

میں میٹرک کے بعد نظامتِ پٹنہ (نظامت ڈاکخانہ جات) میں ملازم ہو گیا، اس زمانے میں پوسٹ ماسٹر جنرل (ناظم پٹنہ) محمد احمد صاحب تھے، وہ مجھ سے بڑی شفقت کے ساتھ پیش آتے، پھر تراب علی صاحب ناظم ہوئے، تراب علی صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے وہ تنخواہ میں کبھی نوٹ نہیں لیتے تھے، صرف روپئے لیتے اور روپئے بھی باقاعدہ دھوئے جاتے، وہ ہمیشہ بالکل ٹھیک وقت پر دفتر آتے جاتے اور اس پابندی میں ایک منٹ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ دفتر کے اہلکاروں اور افسروں پر ان کا بہت رعب تھا۔ مگر میں ایک دفعہ بیمار پڑا تو وہ میری بیمار پُرسی کو آئے اور بہت پھل بھی ساتھ

لائے۔ وہ گھر سے نکالے ہوئے نوکر کو دوبارہ ملازم نہیں رکھتے تھے مگر پرانا ملازم ان کے گھر جاتا تو تنخواہ سے زیادہ انعام اکرام دے دیتے، کھانا، مچھر دانی میں بیٹھ کر کھاتے ان کا وطیرہ تھا کہ وہ شام کو موٹر میں بیٹھ کر سڑک پر کھیلتے ہوئے بچوں میں پیسے تقسیم کرتے مگر اس طرح کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

حیدرآباد کے روز کے اُٹھنے بیٹھنے والوں دوستوں میں مرزا مظہر الحسن، برادر مرزا ظفر الحسن یا پھر حیرت بدایونی، محمد مہدی، حمید الدین شاہد، عبدالہادی، اعجاز الحق قدوسی، ناصر حسین، عبدالسبحان، غلام دستگیر، نواب محی الدین علی خان اسیر، بشیر میاں، حبیب احمد خمور وغیرہ کے ساتھ میرا وقت زیادہ گذرتا۔

۱۹۳۹ء میں دو حادثے گذرے، ایک جنگ عظیم کا اور دوسرا میری شادی کا۔ شادی میری دہلی میں ہوئی اور اب میں اپنی بیوی کے ساتھ حیدرآباد واپس آیا اور پہلے آغا پورے میں پھر عظیم پورے میں مکان کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ مولوی عنایت اللہ صاحب ۱۹۳۸ء میں ریٹائر ہو کر ڈیرہ دون چلے گئے تھے، ۱۹۴۰ء میں میں شدید بیمار پڑا اور تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے دلی گیا تو والدہ صاحبہ نے پھر مجھے حیدرآباد نہ جانے دیا۔ میں ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گیا اور اگست ۱۹۴۱ء میں فانی کے انتقال کی خبر سُنی۔ دل پر بڑا اندوہناک اثر ہوا، ایک فانی ہی کیا وقت کے دھندلکوں میں نہ جانے کتنی صورتیں مٹتی دیکھیں۔ حیدرآباد نے میری تہذیبی تربیت میں جو حصّہ لیا ہے اس کا اثر مجھ پر آج تک نہایت گہرا ہے۔

میں حیدرآباد اور اس کی ہستیوں کو زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ نقوش اس بے ادبی اور بے تہذیبی کے دور میں مجھ پر اور گہرے ہوتے جاتے ہیں، مستقبل حال میں، اور حال ماضی میں تیزی سے تحلیل ہوتا چلا جا رہا ہے اور رفتارِ وقت کی یہ تیزی ایک دن مجھے بھی کنارے لگا دے گی مگر میرا حال اب تو یہ ہے ؎

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں
وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں!

فانی کی شاعری اور انبساط

دراصل منفی مسرت کا نام غم ہے۔

اتنا ہنسنا کہ آنسو نکل پڑیں، اس قدر تیز روشنی، کہ نگاہیں خیرہ ہوجائیں اور کچھ نظر نہ آئے، ایسا زہر، کہ دواؤں کے کام آئے، کیا ہے؟ ہنسی کے آنسوؤں کو غم کے آنسو، تیز روشنی کو اندھیرا اور زہر کو دوا پھر بھی نہیں کہا جا سکتا، حالانکہ آنسو غم میں نکلتے ہیں، چیزیں صرف اندھیرے میں نظر نہیں آتیں اور زہر ہمیشہ مہلک ہوتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہی چیز کے داخلی اور خارجی عوامل ہر آدمی پر مختلف کیفیات مرتّب کرتے ہیں اور ہم انہیں ممیز کرنے کے لئے مسرت اور غم، روشنی اور اندھیرا اور زہر اور دوا کے نام دے دیتے ہیں۔ مسرّت کو غم کا، روشنی کو اندھیرے اور زہر کو دوا کا ضد نہیں کہا جا سکتا، بلکہ غم مسرّت کا، اندھیرا روشنی کا اور زہر دوا کا منفی پہلو ہے۔

سائنس کی رُو سے چیزوں کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا، بلکہ تمام رنگ نور میں ہوتے ہیں اور صرف "قبولیت کی صلاحیت" مختلف چیزوں کو مختلف رنگوں میں دکھاتی ہے۔

یہ بات صرف مسرّت و غم، روشنی اور اندھیرے اور زہر اور دوا تک ہی محدود نہیں، بلکہ ہر حُسن و قبح کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ حُسن و قبح کا معیار اور اس کی اثر پذیری بھی مختلف آدمیوں کے لئے مختلف ہو سکتی ہے۔ اسی لئے نہ حسن و قبح کا کوئی ایک معیار مقرّر کیا جا سکتا ہے اور نہ اثر پذیری کا۔ یہ اپنی اپنی "قبولیت کی صلاحیت" پر منحصر ہے۔ دراصل حسن و قبح کا راز تسویہ اور تناسب میں ہے۔ ایک حسین پیکر، یا ایک حسین منظر، جس قدر متناسب ہوگا ہم اس سے متاثر ہوں گے اسی طرح ایک قبیح پیکر یا قبیح منظر جسقدر متناسب ہوگا اسی قدر نفرت یا کراہت ہم پر اثر انداز ہوگی۔

معلوم ہوا کہ جس طرح حُسن کے لئے تناسب یا تسویہ ضروری ہے، اسی طرح قبح کے لئے بھی تناسب اور تسویہ ضروری ہے، ورنہ اثر پذیری معلوم؟ مثال کے طور پر متناسب

سُروں کا ایک نغمہ ہم کو متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح ہم بجلی کی مہیب کڑک سے بھی ڈر جاتے ہیں۔ نغمے کے سُروں میں اگر تناسب نہ ہوتا تو ہم کوئی اثر قبول نہ کرتے۔ اسی طرح اگر بجلی کی کڑک میں سُروں کا تناسب اور تسویہ نہ ہوتا تو ہم بالکل نہ ڈرتے۔ نغمے میں جمالی سُروں کا تناسب ہے اور بجلی میں جلالی سُروں کا۔

ارسطو بھی قبح کو حُسن ہی کی ایک ناگزیر صنف سمجھتا ہے اور اس بات کو مختلف طریقوں سے ثابت کرتا ہے۔ [1] اس کے نزدیک ہر قابلِ تضحیک شئے طربیہ کا موضوع ہوتی ہے اور اس طرح چونکہ قبح فنِ لطیف کی ضمن میں آجاتا ہے، اسی لئے خوبصورت شئے کی ضروری صنف ہوا۔ حسن و قبح دونوں میں سب سے زیادہ اہم اثر پزیری ہے اور جیساکہ ہم بیان کرچکے ہیں، اثر پزیری تناسب اور تسویہ کی پابند ہے۔ قرآن پاک کا دعویٰ ہے:

اَلَّذِی اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ٥ (۳۲ : ۷) یعنی کائنات میں جو کچھ ہے، (ان چیزوں سمیت جنہیں ہم قبیح سمجھتے ہیں) حسین ہے۔ اصل میں قرآنِ پاک عام مفہوم سے الگ حسن کا مفہوم بیان کرتا ہے۔ یعنی ہر چیز تناسب اور تسویہ کے ساتھ پیدا کی گئی ہے، اسی لیے وہ حسین ہے۔ ایک اور جگہ قرآنِ پاک میں اس بات کو اور زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے:

اَلَّذِی خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ (۸۲ : ۷ - ۸)

اس (باری تعالیٰ) نے تیری تخلیق کی (تیرا ہیولا تیار کیا) پھر تیرے (عناصر ترکیبی) میں تناسب اور ہم آہنگی بہ حدِ کمال پیدا کی، پھر تناسب و اعتدال کو جگہ دی، اس کے بعد جیسی صورت بنانی چاہی، بنادی۔"

ان آیات میں انسانی تخلیق سے لے کر اس کی صورت گری تک قرآنِ پاک نے چار ارتقائی مرحلے بیان کئے ہیں:

اوّل: تخلیق اس سے مراد وجودِ انسانی کا خاکہ یا ہیولا بنانا ہے۔

---

[1] (THE RHETORIC AND POETIC VII)

دوم: تسویہ — کسی چیز کے عناصر ترکیبی میں مطلق اور اضافی، ہر حیثیت سے اسی طرح مناسبت اور ہم آہنگی پیدا کرنا کہ وہ موزونی اور کمال کا مظہر بن جائے۔

سوئم: تعدیل — انفرادی اور مجموعی، جزوی اور کلی، مطلق اور اضافی، ہر حیثیت سے کسی چیز کے مختلف اجزا میں تناسب اور اعتدال پیدا کرنا۔

چہارم: ترکیب صوری — صورت شکل بنانا (اس میں ڈیزائین بنانا بھی مضمر ہے)

تخلیقی فعلیت کے ان ارتقائی مرحلوں سے حسن کا راز تسویہ اور تعدیل ہی میں مضمر ہوتا ہے، چنانچہ ثابت ہوا کہ جس چیز میں تسویہ اور تعدیل ہے، وہ حسین ہے، خواہ وہ کوئی نغمہ ہو یا مہیب آواز، مسرت ہو یا غم، رات ہو یا دن۔

آگسٹائن (THE HARMONY OF HARMONIES) میں کہتا ہے:

"بلاشبہ کاروبارِ فطرت کے بعض مظاہر ایسے بھی ہیں جن میں تمہیں حسن و خوبی کی کوئی گیرائی محسوس نہیں ہوتی۔ تم کہتے ہو کہ قمری و بلبل کی نغمہ سرائی کے ساتھ ساتھ زاغ و زغن کا شور و غوغا کیوں؟ لیکن تم بھول جاتے ہو کہ ہستی کے ساز کا نغمہ کسی ایک سُر کے آہنگ سے نہیں بنتا اور بننا بھی نہیں چاہیئے تھا۔ جس طرح آلاتِ موسیقی میں زیروبم کے تمام آہنگ ہوتے ہیں، اسی طرح سازِ فطرت میں بھی اُتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہیں۔ فطرت کی تالیف کے لیئے جس طرح قمری و بلبل کا ہلکا سُر ضروری تھا، اسی طرح زاغ و زغن کا بھاری اور کرخت سُر بھی ناگزیر تھا۔"

برا اہلِ ذوق درِ فیض در نمی بندند
نوائے بلبل اگر نیست صوتِ زاغ شنو

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز قبیح نہیں ہے۔ یہاں تک کہ غم بھی۔ غم مادی ہو یا روحانی، اسی صورت میں متاثر کرے گا۔ اگر اس کے اجزائے ترکیبی متناسب اور معتدل ہوں گے۔ رُوح اسے شدت سے محسوس کرے گی اور اس کا اظہار بھی شدید ہوگا، لیکن دوسروں کو متاثر کرنے اور خود متاثر ہونے میں فرق ہے۔ غم کے اظہار میں بھی تناسب اور اعتدال ضروری ہے، فانی کا غم اور اس کا اظہار ان کا اپنا ہے۔ وہ اظہار

سے پہلے اس غم کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اسی لئے ان کے اظہار کا پیرایہ بھی شدید ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار متاثر کرنے کی اعلا صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے غم کے "تناسبات" اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ قاری ان کے غم کو اپنا غم اور ان کے پیرایۂ اظہار کو اپنا پیرایۂ اظہار سمجھنے لگتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا!
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ایک فن کار کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ جذبے اور اظہار، دونوں میں سچا ہو۔ یہ بات فانی اور ان کی شاعری پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ انہوں نے جذبے کی سچائی میں "دکھ کی روحانیت پسندی ترقی ہے" (THE SPIRITULISATION OF PAIN IS PROGRESS) پر عمل کیا ہے اور اظہار کی سچائی کے ثبوت میں ان کا سارا کلام پیش کیا جاسکتا ہے، جو تاثیر سے بھرپور ہے، کیونکہ جن اجزا سے وہ مرکب ہے، وہ متناسب اور معتدل ہیں اور اس طرح فانی کا غم حسن بن کر سامنے آتا ہے اور ان کا کلام پڑھنے والے پر نہایت گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ فانی کا غم، غمِ محبت ہے۔ میر کی طرح غم روزگار نہیں اور اگر کہیں یہ جھلکیاں ملتی ہیں تو وہ بھی غم محبت کے پرتو سے اپنا جلوہ الگ دکھاتی ہیں ؎

غم ہائے روزگار سے ممکن نہیں گریز
یہ بھی ترے ستم میں سموئے ہوئے سے ہیں

ان کے غمِ محبت کے اجزائے ترکیبی سوز و گداز، ہجر و وصال کی محرومیاں اور نامرادیاں، صبر و رضا، وفاکیشی و وفادوستی، شکر و شکایت، سپردگی و جاں سپاری، جبر و اختیار اور احساس حسن و عشق ہیں۔ وہ انہی سے اپنی شاعری کا تانا بانا بنتے ہیں، اور اس طرح حسنِ فکر و رعنائی خیال کے جلوے دکھاتے ہیں۔

ان کے بعض قاری اور ناقد انہیں قنوطی اور موت کا شاعر کہتے ہیں اور میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ جب کہ ان کی تمام شاعری ادراکِ غم اور شعورِ غم سے دلوں میں حوصلہ مندی اور عیش کوشی کی تڑپ پیدا کرتی ہے اور اس کے ثبوت میں ان کے یہ

شعر ملاحظہ ہوں ؎

ممکن نہیں ہے راحتِ دنیا کی آرزو
غم پر گمانِ راحتِ دنیا کیے بغیر

غم کو جو خوشی بنا کے چھوڑے !
فانی وہ نصیب چاہتا ہوں

غم بھی گزشتنی ہے خوشی بھی گزشتنی
کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

جیتے بھی ہیں تجھ پہ مرنے والے
غم زہر نہیں جو کام کر جائے

حالات سے مجبور ہو کر مرنے کی تمنا سب نے کی ہے، حتیٰ کہ یہ تک کہہ دیا کہ مرنے کے بعد چین نصیب نہ ہوا تو پھر کیا کریں گے، لیکن فانی کی فکرِ بلیغ اس منزل سے آگے ہے۔ وہ ایسے دن کی تمنا کرتے ہیں جب مرنے کی تمنا دل میں باقی نہ رہے۔ یہ ترکِ دنیا نہیں، ترکِ عقبیٰ نہیں، شائد ترکِ ترک والی منزل کے ہم پلہ ایک ایسی آرزو ہے، جس کی مثال زبانِ اُردو ہی میں نہیں۔ شائد دنیا کی کسی شاعری میں نہ مل سکے۔ فرماتے ہیں ؎

ایسا بھی کوئی دن مری قسمت میں ہے فانی
جس دن مجھے مرنے کی تمنا نہ رہے گی

وہ زندگی کو جاوداں بنانے کے آرزومند ہیں اور یہی حوصلہ مندی وہ دوسروں میں بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ غم کو حسین اور دلکش بنانے کے تمنائی ہیں اور یہی کوشش ان کے سارے کلام میں نظر آتی ہے۔ وہ بعض کے نزدیک اندوہ پسند (SADISTIC) ہوں گے، لیکن میری ذاتی رائے اس سے مختلف ہے۔ ان کی غم کوشی کی اس سے بڑی

دلیل کیا ہوگی کہ وہ غم تک سے خوشی اور مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میں پھر وہی بات دُہرانی چاہتا ہوں کہ فانی نے "درد کو رُوحانی" بناکر انسانیت کی بہت سی بلندیوں کو چھُوا ہے۔ پھر غور کیا جائے تو تہذیبی اور مذہبی ارتقا کی تمام کوششیں بھی تو انہی منزلوں کی طرف آدمی کو لے جانا چاہتی ہیں، جہاں زندگی سوائے راحت اور مسرت کے اور کچھ نہ ہو اور اسی تگ و دو میں انسان نے کتنی "ناگواریوں" کو "گوارا" کا مقام دے رکھا ہے۔ تو پھر اگر فانی "غمِ ناگوار" کو "گوارا" بنانا چاہتے ہیں تو ان پر قنوطی ہونے کا لیبل کیوں لگایا جائے۔؟

فانی کے غم کے اجزائے ترکیبی جو خمیر اُٹھاتے ہیں، وہ روح میں بالیدگی اور تازگی پیدا کرتے ہیں، نہ کہ زندگی سے اُکتاہٹ اور گھٹن۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں ؎

شام سے پہلے مرتے ہیں یا آخر شب تک جیتے ہیں
تیرے بغیر نہ جینے والے دیکھیے کب تک جیتے ہیں

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو، زنجیر بھی درکار نہیں

ایک شعر ملاحظہ ہو۔ موت کے مقابلے میں زندگی کو کتنا بے وقعت بتا کر دنیا پر اور بھی زیادہ حقارت کی نظر ڈالی ہے۔ اندازِ بیان میں کس درجہ استغنا ہے ؎

دنیا میری بلا جانے، مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں، ہستی کی کیا ہستی ہے

اور فرماتے ہیں ؎

بوئے خزاں سے مست ہیں، یاد ہمیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں، پھول کہاں کے، خار کیا

تسکین عجیب چاہتا ہوں
دشمن کا نصیب چاہتا ہوں
تم دل میں بھی رہ کے دُور سے ہو
کچھ اور قریب چاہتا ہوں!

غالب نے تو یہ کلیہ بیان کر دیا تھا کہ درد حد سے بڑھ کر دوا بن جاتا ہے اور گویا اس طرح اس کا ازالہ خود بخود ہو جاتا ہے، لیکن فانی کے نزدیک دردِ محبت سے کبھی چھٹکارا نصیب نہیں ہوتا، بلکہ یہ اعتمادِ محبت کی انتہا ہے کہ کوئی فائدہ نہ ہونے کے باوجود محبوب کو ہر درد کی دوا سمجھا جائے ؎

اللہ رے اعتمادِ محبت کہ آج بھی!
ہر درد کی دوا ہیں وہ، اچھا کیے بغیر

اور پھر یہ اندازِ بیان بھی خوب ہے ؎

نامراد رہنے تک نامراد جیتے ہیں!
سانس بن گیا اک اک نالہ نارسا ہو کر

مہربانی کی آس رہنے دے!
کون جیتا ہے مہربانی تک

جوانی کو قیامت خیز، تو سبھی نے کہا ہے، لیکن اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد جب موضوعِ گفت گو کو انتہائی عروج پر لانا چاہا تو محبوب کی جوانی کا ذکر کیا گیا، اس کی سب سے زیادہ اہمیت پر دلالت کرتا ہے ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا!
بات پہنچی تری جوانی تک!

مر مر کے جیئے جانے کا دعویٰ تو بہت سے شاعروں نے کیا ہے لیکن یہ خیال انوکھا بلکہ نادر ہے کہ موت کی مشکلات کے پیشِ نظر برابر جیتے رہنے کی صورت گوارا کی گئی ہے

تو دشنہ و پہلو میں حائل نظر آتا ہے
جیتے ہیں کہ مر جانا مشکل نظر آتا ہے

فانی کے مخصوص طرزِ نگارش کی چند اور مثالیں حسبِ ذیل ہیں :

خود تجلّی کو نہیں اذنِ حضوری فانی !
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

دل کے سوا یہاں کوئی محرمِ رازِ دل نہیں
بے خبروں سے کیوں کہیں اہلِ خبر سے کیا کہیں؟

حُسنِ جفا پسند سے حسرتِ عرضِ شوق کیا
تشنہ لبی کا ماجرا آب گہر سے کیا کہیں ؟

رہ گئی حسرتِ وفا باقی ! !
دل کو اندازۂ ستم نہ ہوا
بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی
مُنہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

فانی کے ان اشعار میں وہ تمام اجزا آگئے ، جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ یہ اجزا فانی کی شاعری کو سراسر حُسن بناتے ہیں اور حُسن ہمیشہ انبساط کا سبب ہوتا ہے نہ کہ غم گینی اور قنوطیت کا۔ اسی اعتبار سے فانی کے اندازِ فکر اور حُسنِ بیان کو منفرد کہا اور سمجھا جاتا ہے۔

فانیؔ اور اُن کا عمومی اِحساس

غم اور خوشی کے احساس اور اس کے رد و قبول کے طریقے ہر شخص کے لئے مختلف ہیں اسی طرح (SELF CONSOLATION) یعنی ذاتی اطمینان کے بھی ہزاروں پہلو ہیں، بعض لوگ زندگی کی عارضی اور مصنوعی مسرتوں سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کا عادی بنا لیتے ہیں، کچھ لوگ اپنے داخلی احساسات کی لذتوں سے خوشی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں معلوم نہیں اس میں سے کونسا طریقہ بہتر ہے، بہر حال فرار کی صورت دونوں میں ہے نطشہ کا قول ہے۔ (ALL PROGRESS IS THE SPIRITULISATION OF PAIN) یعنی درد کا روحانی بننا ترقی ہے، اس ترقی میں بھی شکست خوردگی کے قبول کا احساس پایا جاتا ہے اور ہمارے سامنے مظلوم انسانیت کی پوری داستان آجاتی ہے، انسان ازل سے ابدی سکون اور راحت کے حصول میں سرگرداں رہے اور خوشی ہو خواہ غم اس میں آسودگی کی تلاش، ہر طرح شکست خوردگی کی قبولیت کے احساس ہی کو وہ مسرت کا نام دیتا ہے یا یہاں ترقی سے وہ تمام مسرتیں مراد ہیں جو زندگی کی کشمکش میں ہمیشہ آدمی کو فریب دیتی رہتی ہیں۔

زمانے کا کوئی دور ایسا نظام زندگی نہ پیش کر سکا جو مظلوم انسانیت کے لئے آسودگی کا ذریعہ بنتا، زندگی اپنی تمام قوتوں اور رعنائیوں کے باوجود کبھی موت پر فتح نہ پا سکی، دنیا کی تمام راحتیں غم کی ٹھوس حقیقت کو کبھی نہ جھٹلا سکیں، راحتوں کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی نے "غمِ گوارا" کو راحتوں کا نام دے رکھا ہے۔ "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے، لیکن "تو با زمانہ بساز" یا "با زمانہ

ستیز" کا احساس ہی زمانے کی قوتوں کو مستحکم کر دیتا ہے، صلح اور جنگ کا خیال ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اپنی کمزوریوں کا پورا پورا یقین ہو جائے یا اپنی قوتوں کا اندازہ کرنا مقصود ہو۔ فانی کو اپنی شکست خوردگی کا احساس ہے لیکن وہ عام آدمیوں کی طرح اپنی مجبوریوں اور ناکامیوں پر ماتم نہیں کرتے بلکہ وہ اس احساس کو خوشی سے قبول کرتے ہیں اور اس میں آسودگی اور طمانیت کے راستے تلاش کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ زندگی کے تمام حواس اس سے متاثر ہوں، کیونکہ اس کے علاوہ انہیں کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آتا، رفتہ رفتہ یہ کوشش ہی ان کی زندگی بن جاتی ہے، اور اس طرح وہ غم میں آسودگی اور خوشی کے راستے تلاش کر لیتے ہیں ایک جگہ خود اس اصول کی وضاحت کرتے ہیں ؎

ممکن نہیں ہے راحتِ دنیا کی آرزو
غم پر گمانِ راحتِ دنیا کئے بغیر

اس شعر میں "راحتِ دنیا کی آرزو" میں زندگی کی تمام فعالی قوتوں کا احساس ملتا ہے لیکن زندہ رہنے اور زندگی کے حصول کی تڑپ بھی۔

فانی کی تمام شاعری کا بنیادی پس منظر غم کا شدید احساس ہے، زندگی کا ایک پہلو غم بھی تو ہے، اس کا اظہار و احساس بھی خوشی کے احساس و اظہار کی طرح ضروری ہے، بلکہ فانی کی شاعری میں غم کا یہ احساس خوشی کے حصول کی غمازی کرتا ہے، چیزیں ہمیشہ اپنی ضدوں ہی سے پہچانی جاتی ہیں۔

غم کے اس شدید احساس کے ساتھ ساتھ فانی کی شاعری میں فردیت اور انفرادیت کا جذبہ بھی شدید ہے، ہو سکتا ہے بعض لوگ اسے "احساسِ کمتری" کہیں، لیکن میرے نزدیک اس فردیت کے شدید احساس میں بھی اپنے وجود کی بقا اور قیام کی تمنا پائی جاتی ہے، قابیل کا ہابیل کو مار ڈالنا بھی قابیل کی زندگی کی تمنا کا پورا ثبوت ہے اور اس میں اپنی انفرادیت کے قیام کی خواہش بھی موجود ہے خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، میرا مطلب اس فردیت اور انفرادیت کے احساس سے یہ واضح کرنا

ہے کہ فانی نے شکست خوردگی کے احساس میں بھی اپنی ذات کے قیام اور بقا کے پہلو رکھتے ہیں۔ اب اس ثبوت میں کچھ مثالیں سنئے ؎

عزتِ رسوائی بھی کہیں تدبیر سے حاصل ہوتی ہے
حیف ہے اس کی قسمت پر جو عشق میں رسوا ہو نہ سکا

وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر کرم میرا
مگر منجملۂ آدابِ غم خواری ہے غم میرا

چھین لیا تیری محبت نے مجھے
اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی !!

اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
وعدۂ دید چاہیئے زحمتِ انتظار کیا !!

اپنی ذات کا یہ عرفان اور اپنی فردیت کا یہ احساس سپردگی اور جذباتِ عشق کے ساتھ تھا اب اسی جذبہ کو زندگی اور غم دنیا میں دیکھئے ؎

زمانہ برسرِ آزار تھا مگر فانی !!
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی
منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

ایذا نہ رہے گی جو گوارا نہ رہے گی
چھیڑا ہمیں دنیا نے تو دنیا نہ رہے گی

حشر امید سے مراد ہیں ہم !!!
گلہ ہائے دراز ہیں ہم لوگ !

عبودیت کے مدارج میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے ؎

دور لے جا ہٹا کے سرحدِ ناز
دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز !

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ

اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

بندگی اور انکسار کے مدارج میں وہ آستان اور سر کی قیدوں سے آزاد ہو کر اب قیدِ بندگی سے بھی آزاد ہونا چاہتے ہیں، لیکن اس طرح کہ احترام حسن میں کوئی فرق نہ آنے پائے اور "اک سجدہ چاہتا ہوں" کہہ کر بندگی کی معراج وہ ایک ہی جست میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

جبر و قدر کے مسائل میں بھی وہ اپنی ذات کو نہیں بھولتے، فرماتے ہیں ؎

زہے تقدیرِ ناکامی کہ تیری مصلحت ٹھہری

تری مرضی سے وابستہ ہوا اللہ رے غم میرا

یہ مثال بھی دلچسپی سے خالی نہیں ؎

تو تبسم بھی شریکِ نگہۂ ناز ہوا

آج کچھ اور بڑھا دی گئی قیمت میری

یہاں بھی اپنی ہی قیمت کا احساس کارفرما ہے۔

تصوف کے مسئلوں میں بھی انہیں اپنا عرفان رہتا ہے اور ان مضامین کو انہوں نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے ؎

میری نظروں میں تو بے واسطۂ دید ہے تو

میں بعنوانِ تجلی بھی تجھے یاد نہیں

ہم ہیں اس کے خیال کی تصویر!

جس کی تصویر ہے خیال اپنا

نورِ برقِ معرفت بخشا دلِ آگاہ نے

ورنہ پہلے سوزِ غم اک شعلۂ بے ہوش تھا

ہو بھی چکے تھے دامِ محبت میں ہم اسیر

عالم ابھی بقیدِ زمان و مکاں نہ تھا

ان مثالوں سے یہ وضاحت کرنی مقصود تھی کہ فانیؔ کی شاعری میں غم کے شدید احساس کے ساتھ اپنی ذات کی بقا اور اس کے وجود کی تمنا بھی شدت سے پائی جاتی ہے اور اب میں فانیؔ کی شاعری سے غم کی کچھ نئی تعریفات پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ فانیؔ نے غم کو کچھ نئی قدریں دے کر اردو شاعری میں متعارف کرایا ہے۔ کہیں غم سے ان کی مرادِ ذاتی زندگی کا عرفان و احساس نہیں بلکہ تمام آفاق کی زندگی کی وسعتوں اور قوتوں کا اندازہ ہے۔ مثلاً ؎

غم کو بنا کے محرمِ اسرارِ کائنات
ہر نقشِ غم کو پیکرِ انساں بنا دیا!

زندگی کا کوئی پہلو ہی نہ تھا جو غم نہ تھا
ہوش کا سودا جنونِ عاشقی سے کم نہ تھا

ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے
گل خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے

رفتۂ بیمِ خزاں تھی اس چمن کی ہر بہار
خندۂ گل تھا مگر بے گریۂ شبنم نہ تھا

فانیؔ نے کبھی غم کے نازک پہلوؤں سے تعریفاتِ حسن کا بھی کام لیا ہے، فرماتے ہیں ؎

غم راز ہے ان کی تجلّی کا جو عالم بن کر عام ہوا
دل نام ہے ان کی تجلّی کا جو راز رہی عالم نہ ہوئی

یا یہ شعر سنیئے ؎

بہار نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری!
خزاں شہیدِ تبسم ہوئی بہار ہوئی!

اردو شاعری میں غزل کی پوری تاریخ میں غالباً غم کی یہ نئی قدریں نہیں ملیں گی ایک اور غم کی نئی تعریف ملاحظہ کیجئے ؎

دیر میں یا حرم میں گذرے گی
عمر تیرے ہی غم میں گذرے گی

یہاں غم سے (مجبور) عبودیت کی وضاحت کس قدر اچھی طرح کی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے غم سے فانی نے اپنی ذات کے عرفاں کا بھی کام لیا ہے اور "مگر منجملۂ آداب غم خواری ہے غم میرا" کا اظہار بار بار کیا ہے اس کے علاوہ جبر و قدر کے مسائل میں بھی بڑی بڑی نازک باتیں کہی ہیں، آدمی کو احساس کی دولت بخشی جاتی ہے اور اس کے ساتھ جو حواس دیئے جاتے ہیں وہ نامکمل اور مکمل دونوں ہیں، کچھ قدرتیں عطا کر کے مجبورِ محض بنایا جاتا ہے یہ کشمکش موت اور زندگی کے درمیانی درجہ سے کم نہیں ؎

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں!
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں!
فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

ازل سے آج تک انسان نے ابدیت حاصل کرنے کی بے شمار کوششیں کی ہیں اور کیوں نہ کرتا اس کائنات میں خدا کے بعد اولیت کا تاج ہمیشہ سے انسان کی پیشانی ہی پر کج رہا ہے، اپنی قوتوں سے خدا کے اختیارات میں دخل دینا چاہا ہے موت پر قدرت چاہی ہے لیکن یہ کوشش ہمیشہ نامشکور ہوئی۔ اس تمنا کو فانی کے یہاں دیکھئے۔ ؎

ایسا بھی کوئی دن مری قسمت میں ہے فانی
جس دن مجھے مرنے کی تمنا نہ رہے گی

"مرنے کی تمنا نہ رہے گی" کا مطلب زندگی کو ختم کر دینا نہیں ہے بلکہ زندگی کو ابدی اور دائمی بنانا ہے، یہاں تمنا کا لفظ اس کوشش کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ سے آدمی نے ابدی بننے کے سلسلے میں کی ہے، ممکن ہے آدمی کی یہ کوشش کبھی آدمی کو بھی خدا کی طرح دائمی بنا دے مگر ابھی تک یہ کوشش تمنا اور آرزو سے زیادہ نہیں ؎

آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت
یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی !

موت کے بعد زندگی، زندگی کے بعد موت یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ زندگی کا (PENDOLUIM) ٹلکن گشت اور باز گشت کی خدا معلوم کتنی حرکتوں سے اس حیات کو گذارتا ہے۔

بہرحال فانی کی ساری شاعری غم سے آسودگی حاصل کرنے کی ایک کوشش ہے۔ جو شخص غم سے خوشی حاصل کرتا ہو میں اسے قنوطی نہیں کہوں گا بلکہ شاید وہی مسرتیں زیادہ مستحکم ہوتی ہیں جن کے حصول کا ذریعہ غم ہو۔ فانی کی شاعری میں غم کا نتیجہ غم نہیں بلکہ غم ایک ذریعہ ہے خوشی کا۔ جو شخص "جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم" اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتا ہو، زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا نظریہ جس شخص کا اصولِ حیات ہو اور جو "یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی"، کا نعرہ لگا کر زندگی تو زندگی موت کو بھی اپنی زندگی بنانا چاہتا ہو اُسے قنوطی کہنا درست نہیں، فانی کی شاعری کا عمومی احساس اور ان کے لہجے کی یکسانیت ڈوبتے چاند کی پھیکی چاندنی کی طرح دل و دماغ پر چھا جاتی ہے ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ منظر پسند نہ آئے۔

فانی کی شاعری میں اُن کی زندگی

ہندوستان میں ایسے ادیب کم ہیں جن کے ادب میں اُن کا کردار یا اُن کی زندگی بھی نمایاں ہو، یہی وجہ ہے کہ ادب اور ادیب دونوں اپنی زندگی میں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں اور نہ ادیب کی زندگی اس کے ادب پر اثر انداز ہوتی ہے نہ ادب، ادیب کی زندگی پر، ادب کو شہرتِ دوام مِل جاتی ہے لیکن ادیب کی زندگی ادب کے ساتھ زندہ نہیں رہتی حالانکہ اصول یہ ہونا چاہیئے کہ ادیب کی زندگی اور ادب دونوں ساتھ بقائے دوام پائیں!!

فانی اُس دور میں پیدا ہوئے جب اُردو شاعری میں میر، مومن اور غالب جیسی باکمال ہستیاں پیدا ہو چکی تھیں لیکن سوائے میر اور مومن کے غالب بھی اپنے ادب میں اپنے کردار اور اپنی زندگی کی جھلکیاں نہیں دکھاتے اسی طرح موجودہ دور میں بھی بہت سے ایسے باکمال شاعر ملتے ہیں جن کا ادب اور زندگی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اثر سے اُن کی شاعری مُعرّا ہے۔

فانی نے ابتدائے زندگی ہی سے اپنے مسائلِ حیات کو اپنے ادب میں سمونا شروع کیا وہ خوشحال خاندان میں پیدا ہوئے، اپنی میراث کو اپنی افتادِ طبع یا ناتجربہ کاری کی وجہ سے کھو بیٹھے اس کے بعد کشاکشِ حیات نے اُن کو کشمکش کے لئے مجبور کیا، اٹاوہ، لکھنؤ، آگرہ، بدایون اور حیدرآباد میں اُنھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے اُتار چڑھاؤ دیکھے اور اب زندگی ان کے سامنے آئینہ تھی وہ ہر تصویر اور ہر خیال کو اُس میں متشکل دیکھ لینے پر قادر تھے۔

فانی شدّتِ احساس کی وجہ سے زندگی کی بہت سی راحتوں سے محروم رہے اور اپنے ماحول کے اس قدر خوگر ہو گئے تھے کہ عملی طور پر بھی وہ "حصولِ غم" کو "حصولِ عشرت" سے تعبیر کرتے تھے اور اس طرح زندگی اُن کے لئے عشرتِ غم یا غمِ عشرت بن کر رہ گئی تھی اور اُن کی زندگی کا یہی پہلو اُن کی شاعری کی زندگی ہے!!

فانی کی ادبی زندگی اُن کی مادی زندگی سے مختلف نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مکمل انفرادیت ہے۔

فانی نے زندگی کی حقیقت کا ادراک اپنے حواسِ باطنی سے حاصل کیا اُن کے حواسِ باطنی اس قدر مکمل تھے کہ وہ خارجی دنیا کو اپنی داخلی دُنیا میں جذب کر لینے پر قادر تھے۔ فانی ہمیشہ اپنے لئے تحریکِ شعری اپنے حواسِ باطنی سے پیدا کرتے اور یہ تحریک اکثر غم اور ادراک یا اِدراکِ غم سے ہوتی۔

زندگی اور منشائے زندگی پر فانی نے بہت گہری تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ کیونکہ فانی کا زندگی کی کشمکشوں سے بے حد قریبی تعلق رہا ہے، اُنھوں نے اپنی شدّتِ احساس سے دوسروں کی زندگی کے تاثرات بھی اپنے اوپر مستولی کئے ہیں اور اکثر زندگی پر تنقید کرتے ہیں اپنی آرزوؤں اور اپنی تلخ کامیوں کو اس تنقید سے علیحدہ رکھا ہے تاکہ وہ صحیح عرفانِ حیات حاصل کر سکیں۔

فانی کی خصوصیاتِ شاعری اُن کی زندگی کی پیداوار ہیں اس لئے جو کچھ اُن کی زندگی ہے وہی اُن کا ادب ہے۔

"غم" کو فانی نے اُردو شاعری میں بہت وسیع معنی کے ساتھ متعارف کرایا ہے کبھی غم سے اُن کی مراد زندگی کی لامحدود وسعتوں کا اندازہ اور احساس ہے کبھی غم سے وہ عشق کے شدید جذبات کی وضاحت کرتے ہیں اور کبھی غم سے وہ حُسن کے تاثرات اور اُس کی تعریفات کے اظہار کا کام لیتے ہیں کبھی غم سے وہ بہت ہی عجیب مفہوم پیدا کرتے ہیں جو ذہن پر کیف بن کر چھا جاتا ہے ؎

دیر میں یا حرم میں گذرے گی

عمر تیرے ہی غم میں گذرے گی

فانی کے یہاں سپردگی، احساسِ حُسن، انا العشق، عرفانِ حیات، اور پندارِ عجز کے شدید جذبات غم کی مسرّتوں میں بہت زیادہ سموئے ہوئے ملتے ہیں اور یہی عنوانات اُن کی زندگی کے بھی مدارج ہیں۔

سپردگی میں فانی نے اپنی انفرادیت اور اپنے جذبۂ خودی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا

ہے لیکن اس طرح کہ احترامِ حُسن یا انکسارِ شوق کو جس سے وہ زندگی کی معراج حاصل کرنا چاہتے ہیں اور بلند و اعلیٰ بنا دیا ہے اور یہ جذبہ اس قدر ان کی زندگی میں دخیل تھا کہ وہ لوگوں کے ساتھ اشیائ کے بھی حفظِ مراتب کا خیال رکھتے تھے حتیٰ کہ اپنے خیالات اور اپنے احساسات میں بھی وہ اسی اصول کے پابند تھے مگر یہ جذبہ اُن کے ذاتی مراتب کا بھی احساس رکھتا تھا، اس طرح انہوں نے عجز کو "عزورِ عجز" کا درجہ دیا ہے اُردو شاعری میں یہ اجتہاد بھی کم ہے ۔

میری نظروں میں تو بے واسطۂ دید ہے تُو
میں بعنوانِ تجلّی بھی تجھے یاد نہیں؟

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

چُن لیا تیری محبت نے مجھے
اور دنیا ہاتھ مَل کر رہ گئی !

ہو بھی چکے تھے دامِ محبت میں ہم اسیر
عالم ابھی بقیدِ زمان و مکاں نہ تھا

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی
مُنہ پھیر لیا ہم نے تو دُنیا نہ رہے گی

اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
وعدۂ دید چاہیئے زحمتِ انتظار کیا!

زہے تقدیرِ ناکامی کہ تیری مصلحت ٹھہری
تری مرضی سے وابستہ ہوا اللہ رے غم میرا

تو تبسم بھی شریکِ نگہِ ناز ہوا
آج کچھ اور بڑھا دی گئی قیمت میری

مرے شوق نے سکھایا اُسے شیوۂ تغافل
نہ مجھے نیاز ہوتا نہ وہ بے نیاز ہوتا

وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر کرم میرا
مگر منجملۂ آدابِ غمخواری ہے غم میرا

دُور لے جا ہٹا کے سرحدِ ناز!
دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز!

احساسِ حُسن کے جذبات بھی فانیؔ کے یہاں ملتے ہیں اور یہی جذبات اُن کی تعمیر کے لئے بنیاد ثابت ہوتے، جس حُسن نے فانیؔ کو زندگی کا عرفان بخشا اور جس کی ایک شعاع سے اُنہیں حقیقتِ اشیا کا علم نصیب ہوا کیسے ممکن تھا کہ وہ اُن کی تعریف اور توصیف سے محروم رہ جاتا۔ حُسن نے اپنا احساس اور ادراک فانیؔ کو عطا کیا اور فانیؔ نے بھی ادراک اور احساس دوسروں تک پہنچایا اور انہوں نے حُسن کی طرح زندگی کو اَبدی، لامحدود اور لازوال بنانے کا احساس دلوں میں پیدا کرکے زندگی میں حُسن پیدا کیا ہے ؎

نورِ برقِ معرفت بخشا دلِ آگاہ نے
ورنہ پہلے سوزِ غم اک شعلۂ بے ہوش تھا!

مجھ سے ہر جلوہ نے سیکھا امتیازِ قلب و سنگ
ورنہ حُسنِ دوست کا آگے تو یہ عالم نہ تھا

اس دعوے کے ثبوت بھی غور طلب ہیں۔

فرصتِ یک نظر کے بعد حوصلۂ تماشائے جمال
کیوں دلِ قدر ناشناس اب یہ مجال ہو گئی؟

عرفانِ معرفت کو سمو کر محال میں!
وہ دل میں یوں رہے کہ نہ آئے خیال میں

جب کی ہے فکر تجزیۂ ہر مثال میں
گم ہو گئی ہے اُن کی تجلی جمال میں

ہر لطافت کا تصوّر، ماسوا آلودہ ہے
آئینہ دل کا تری تصویر کے قابل نہیں!

تھی ہر تڑپ سکون کی دنیا لیے ہوئے
پہلو میں آپ تھے کہ دلِ ناصبور تھا

خود تجلّی کو نہیں اذنِ حضوری فانی
آئینے اُن کے مقابل نہیں ہونے پاتے

ہر تجلّی ہے اک نظامِ جمال
لاکھ عالم ہیں ایک عالم کیا!

عشق ہے پرتوِ حُسنِ محبوب
آپ ہی اپنی تمنّا کیا خوب!

طلبِ محض ہے سارا عالم!
کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب

تجھ میں اور تیرے تصور میں جدائی تھی محال
درمیاں کوئی حجابِ غمِ آغوش نہ تھا

آئینہ و دل دونوں کہنے ہی کی باتیں تھیں
تیری ہی تجلّی تھی اور تو ہی مُقابل تھا

اُن کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اِک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

وہ جلوہ مفتِ نظر تھا نظر کو کیا کہیئے
کہ پھر بھی ذوقِ تماشا نہ کامیاب ہوا

ہر ذرّہ جلوہ گاہ ہے ہر دل ہے چشمِ شوق
اللہ رے اہتمام تماشائے یار کا!

دنیائے حسن و عشق میں کس کا ظہور تھا
ہر آنکھ برق پاش تھی ہر ذرّہ طور تھا

میری نظر کی آڑ میں اُن کا ظہور تھا
اللہ اُن کے نُور کا پردہ بھی نُور تھا

ہم ہیں اُس کے خیال کی تصویر
جس کی تصویر ہے خیال اپنا

آپ ہی اپنی آڑ میں تُو ہے!
تو حقیقت ہے اور تُو ہی مجاز

حُسن ہے جاوداںِ بے آغاز
عشق، آغازِ جاوداں انجام

غرض اسی حُسن جاوداں بے آغاز کے احساس و ادراک کا نام ہے فانی کی زندگی!! اور اس آئینہ میں وہ اپنی فردیت کے انوار دیکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی دکھلاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ فرق یا حجابِ درمیان اُٹھ جائے اور حُسن اور عشق حُسن بن کر رہ جائے ۔

میرے سوا تھا اور جو پردے سارے کے سارے چاک ہوئے
یہ بھی اگر اللہ نے چاہا کوئی دم میں چاک ہوا

انا العشق کی توضیح فانی نے مختلف طریقوں سے کی ہے، کہیں انکسارِ محض سے کہیں تعریفات حُسن کے ساتھ ساتھ پندارِ شوق سے بھی، کہیں احساسِ خودی سے اور کہیں صرف غمِ آرزو سے، فانی نے اپنی جوانی میں محبت کے جادو جگائے لیکن وہ معراجِ محبت میں انکارِ مجسّم رہے اور عجز و شوق کے وہ مدارج حاصل کیے کہ "غرورِ عجز" اُن کی فطرت بن گیا اور اسی غرورِ عجز نے ان کو عرفانِ خودی بخشا، ان کے کردار کی ہُو بہُو تصویر کشی اُن کی شاعری کا یہی پہلو کرتا ہے ۔

عزتِ رسوائی بھی کہیں تدبیر سے حاصل ہوتی ہے
حیف ہے اُس کی قسمت پر جو عشق میں رُسوا ہو نہ سکا

تیرا نگاہِ شوق کوئی رازداں نہ تھا ! !
آنکھوں کو ورنہ جلوۂ جاناں کہاں نہ تھا

شام سے پہلے مرتے ہیں یا آخرِ شب تک جیتے ہیں
تیرے بغیر نہ جینے والے دیکھئے کب تک جیتے ہیں؟

میری وفا، جفا فروش، گریہ تبسّم آفریں
عشق کی ساری کائنات صرفِ جمال ہو گئی

تیز تر جادۂ وفا سے گذر !
مٹ رہے ہیں نقوش منزل کے

اُٹھ اے نگاہِ شوق اُٹھ متاعِ جاں لئے ہوئے
وہ دامنِ نگاہ میں ہیں بجلیاں لئے ہوئے

دل ہی نگاہِ ناز کا ایک ادا شناس تھا !
جلوۂ برقِ طُور نے طُور کو کیوں جلا دیا !؟

جل رہے ہیں آج تک دل کے چراغ
طور پر اک شمع جل کر رہ گئی

عشق کی دُنیا زمیں سے آسماں تک شوق تھی
تھا جو کچھ تیرے سوا آغوشِ ہی آغوش تھا

رہ گئی حسرتِ وفا باقی!
دل کو اندازۂ ستم نہ ہوا!

اب کرم ہے تو یہ گلہ ہے مجھے
کہ مجھی پر ترا کرم نہ ہوا!

عشرِ اُمید سے مراد ہیں ہم
گلہ ہائے دراز ہیں ہم لوگ

تیری ناز آفرینیاں ہیں گواہ
کہ سراپا نیاز ہیں ہم لوگ

رفتۂ منظر ہو جا، سب سے بے خبر ہو جا
کھل گیا ہے راز اپنا کھل نہ جائے راز اُن کا

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا
ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا

اللہ رے اعتمادِ محبت کہ آج بھی
ہر درد کی دوا ہیں وہ اچھا کئے بغیر

منزلِ عشق ہے نمودِ وجود
ہم بھی ہیں تیری بدگمانی تک

مہربانی کی آس رہنے دے
کون جیتا ہے مہربانی تک؟

حُسنِ حیرت تو میسر ہے تماشا نہ سہی
تیری محفل میں ہیں گو نقش بدیوار ہیں ہم

پہلوئے زوال ہوں، معنی کمال میں
میں ہوں حدِ امتیاز، جلوہ و جمال میں

کب تک رہینِ ذوقِ تماشا رہے کوئی
اب وہ نگاہ دے کہ تماشا کہیں جسے

فانی کو اس سپردگی اور احساسِ حُسن کے باوجود ایک تشنگی اور ایک تڑپ محسوس ہوتی ہے کبھی اپنے حواس کی کم مائیگی کی وجہ سے اور کبھی محسوسات کی فراوانی کے باعث، شائد اسی تڑپ کا نام ہے غمِ آرزو، اور شوق، اور اسی تڑپ سے شائد عبارت ہے یہ تمام نظمِ حیات!!

فانی نے باوجود شدتِ احساس کے ساری عمر ایک کمی اور تشنگی محسوس کی

ہے بالفاظ دیگر وہ تمام عمرِ صحیح زندگی سے لطف اندوز رہے۔

زندگی کی تنقید میں فانی نے سب سے زیادہ حکیمانہ انداز اختیار کیا ہے اور اکثر حقیقت کو فلسفیانہ اشتباہ اور اشتباہ کو فلسفیانہ حقیقت کی نگاہ سے دیکھا ہے نازک اور لطیف اشارات و کنایات سے پورا پورا مفہوم ادا کیا، استفہامات سے اقرار حقیقت اور محسوسات سے ٹھوس حقیقتیں بے نقاب کی ہیں احساسِ غم اور ادراکِ غم کو اصل حیات اور عینِ زندگی سمجھا ہے اور اسی غم میں وہ زندگی کی ابدی مسرتیں تلاش کرتے ہیں اور غم سے غم اخذ کرنا گناہ کے مترادف سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی نام ہے "حسن کی رہبری میں عرفانِ زندگی کا" اور وہ حسن اور زندگی کو الگ نہیں سمجھتے بلکہ حسن اور زندگی کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں، حسن اور زندگی کے تصادم سے جو چنگاری پیدا ہوتی ہے اسی کو "وہ غم" یا حیاتِ جاوید سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی "غم" یا حیاتِ جاوید کے حصول ہی کو منشائے زندگی سمجھتے ہیں۔

وہ عرفانِ زندگی میں بھی اپنی خودی اور اپنے جوہرِ ذات کو نہیں بھولتے اور جوہرِ ذات اور خودی کے عرفان ہی کو آفرینشِ کائنات کی علت سمجھتے ہیں کہیں یہ جذبہ انفعالی صورت میں پایا جاتا ہے اور کہیں فعالی حالت میں ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں!! سو وہ بھی کیا معلوم؟

عالم جز اعتبارِ نہان و عیان نہ تھا
یعنی کہ تو عیاں نہ ہوا اور نہاں نہ تھا

ہر مژدۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب
عالم دلیلِ گمرہی چشم و گوش تھا

مفہومِ کائنات تمہارے سوا نہیں
تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا

اپنی نگاہوں کا یہ نظّارہ کہاں تک؟
اس مرحلۂ سعیِ تماشا سے گذر جا

یہ ارض و سما یہ جنس و جاں ہیں الفاظ
الفاظ کے معنی بھی یہاں ہیں الفاظ

اک معنیِ بے لفظ ہے عالمِ فانیؔ
معنی کی لطافت پہ گراں ہیں الفاظ

میں نے فانیؔ ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

دل ہے اور سحر سازیِ ادراک
آنکھ ہے اور فریبِ گردشِ رنگ

اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

غم کو بنا کے محرمِ اسرارِ کائنات
ہر نقشِ غم کو پیکرِ انسان بنا دیا

فریبِ جلوہ اور کتنا مکمل ہے معاذ اللہ
بڑی مشکل سے دل کو بزمِ عالم سے اُٹھا پایا

ہلاکِ تلخیٔ ہستا خیرِ موت ہوں فانی
ثباتِ زندگیٔ بے ثبات نے مارا

مرا وجود ہے میری نگاہِ خود نہ شناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا

رفتۂ بیمِ خزاں تھی اس چمن کی ہر بہار
خندۂ گل تھا مگر بے گریۂ شبنم نہ تھا

تجلّیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل
کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

ممکن نہیں ہے راحتِ دُنیا کی آرزو
غم پر گمانِ راحتِ دنیا کئے بغیر

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

زمانہ برسرِ آزار تھا مگر فانی!
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

کیفیتِ ظہورِ فنا کے سوا نہیں
ہستی کی اصطلاح میں دُنیا کہیں جسے

زندگی کی وضاحت فانی نے ہزار ہا پہلو سے کی ہے اور خوب کی ہے لیکن ٹھوس جذبہ جو اُن کی شاعری میں ہر احساس کے ساتھ ملتا ہے وہ اپنے نفس کا عرفان ہے یہ جذبہ حُسن کی ناز آفرینیوں میں بھی نمایاں ہے اور عجزِ بندگی میں بھی، غمِ آرزو کی مسرّتوں میں بھی ہے اور زندگی کے احساس کی تلخیوں میں بھی، غرض خودی کو وہ اصل اور زندگی میں کہیں وہ اس خودی کو وجہ مانتے ہیں تو کہیں عینِ کائنات اور تمام حیات کو اس کا تابع قرار دیتے ہیں لیکن فعالی قوّت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں مگر اس عجزِ بندگی میں بھی وہ بلندی کا احساس رکھتے ہیں اقبال کی طرح ان کی زندگی کا ماحصل یہ ہے کہ

شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن
خویش را دیدن بہ نُورِ خویشتن
شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے
خویش را دیدن بہ نُورِ دیگرے
شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق
خویش را دیدن بہ نورِ ذاتِ حق

صبا اکبر آبادی کی غزل

حضرتِ صبا اکبر آبادی کو میں میرؔ کے قبیلے کا فرد سمجھتا ہوں۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد جناب صبا اکبر آبادی کی شخصیت اکبر آباد (آگرہ) کے لیئے یقیناً باعثِ صد افتخار ہے۔ صبا صاحب اس دور کے نہایت برگزیدہ شاعر ہیں، اُن کی ذات پر اُردو شاعری جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کیونکہ ان کی قادر الکلامی تمام اصنافِ سخن پر محیط ہے۔ وہ اُردو کے غالباً منفرد شاعر ہیں جنہوں نے مختلف اصنافِ سخن میں ایک لاکھ سے زیادہ اشعار کہے ہیں اور اس پُرگوئی کے باوجود اُن کی شاعری تمام محاسنِ شعری سے مملو ہے۔ یہ کمال بھی صبا صاحب ہی کو حاصل ہے کہ وہ پُرگوئی کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی اور اسلوبِ اظہار میں منفرد ہیں۔ اُن کی غزلیں کلاسیکی پیرائے میں جدید خیالات و اظہار کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

وہ دو تہذیبوں کے آدمی ہیں۔ ایک تہذیب وہ جس میں وہ پیدا ہوئے اور دوسری وہ جس میں آجکل وہ زندہ ہیں اور اسی حوالے سے اُن کی شاعری میں دونوں تہذیبوں کی ترجمانی ملتی ہے، پہلے غزل کی تہذیبی ترجمانی کے سلسلے میں ادبی تاریخ کا ایک مختصر سا جائزہ :-

اصل میں غزل بڑی توانا صنفِ سخن ہے، ہزاروں یلغاروں کے باوجود نہ صرف زندہ اور پائندہ ہے بلکہ روز بروز زیادہ پسندیدہ اور ترقی پذیر ہے، غزل کی اس توانائی کا سبب اس کی سچائی ہے، غزل نے ہر دور میں اپنے معاشرے کی پوری پوری ترجمانی کی ہے اور جو سلیقہ اس ترجمانی کا غزل کو حاصل ہے۔ وہ کسی اور صنفِ سخن کو نہیں۔ جیسا معاشرہ ویسی غزل !!

دورِ اوّل ہی کو لیجئے۔ ہندی تہذیب میں جس ایرانی تہذیب کی پیوندکاری شہنشاہِ اکبر نے کی تھی اس کے پورے اثرات شاہ عالم کے زمانے سے نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ یہ اثرات اس دور کے معاشرے میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔

آواخرِ عہدِ اسلامیہ کا طریقۂ تفکر، تصوف سے بہت زیادہ وابستہ رہا ہے۔
تصوف ایک طرف تو اخلاق کے سدھارنے میں بے حد معاون ثابت ہوا۔ اور
تزکیۂ نفس کی کوشش میں سرگرم رہا اور اگر اسلام کو ترقی نہ دے سکا تو کم از کم اسلام کی
ایک صورت کو ضرور برقرار رکھ سکا۔ مگر دوسری طرف عشق کی تعلیم کو صحیح ڈگر پر قائم
نہ رکھ سکا۔ اور جس کے بُرے اثرات اَمرد پرستی کی صورت میں بھی نمودار ہوتے
اور اس طرح عشقِ حقیقی پر عشقِ مجازی کو لوگ ترجیح دینے لگے۔ یعنی دوسرے لفظوں
میں یوں کہیئے کہ حقیقت کی تلاش میں مجاز ملا اور پھر لوگ مجاز ہی میں اُلجھ کر رہ گئے
اور مجاز ہی کو حقیقت سمجھنے لگے، اور اس طرح حقیقت معدوم ہوگئی اور ہر چیز پر
ظاہر پرستی غالب آگئی۔

شاعری تمام فنونِ لطیفہ میں لطیف ترین ہے، اس لئے سب سے زیادہ اپنے
تمدن اور اپنے تفکر کی بھی یہی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تہذیب و تمدن پر چونکہ ظاہر پرستی
کا رنگ چڑھا ہوا تھا اس لئے شاعری میں بھی وہی رنگ نظر آنے لگا۔ عہدِ مغلیہ میں
جو کچھ شاعری تھی وہ ایرانی الاصل تھی۔ فارسی بولی جاتی تھی اور دربار کی زبان بھی فارسی
تھی، اس لئے اُردو میں شعر گوئی وجہِ افتخار نہیں تھی، ویسے بھی اس وقت تک اردو
کا اپنا کوئی ادبی سرمایہ نہیں تھا جس کو لوگ اپنی شاعری کا سرچشمہ بناتے۔ لہٰذا
فارسی کے اتباع میں اُردو کے لئے بھی فارسی ہی کے موضوعات اور معیار لے لئے
گئے یعنی استعارے، تشبیہات، تلمیحات، اوزان و بحور اور مضامین بھی بجنسہٖ
وہی رہے جو فارسی میں تھے۔ ابتدا میں شعر کو اپنا طریق بیان آسان اور سادہ رکھنا
پڑا، یہ سادگی قدرتِ بیاں یا کمالِ فن کی سادگی نہیں تھی بلکہ عصمتِ بی بی بے چادری
کا مصداق تھی۔

ایرانی تہذیب کی پیوندکاری کے نمونے نہ صرف اس تہذیب میں نظر آتے
ہیں بلکہ شاعری میں بھی فارسی کے پُورے پُورے فقروں کے پیوند ملتے ہیں۔

از زُلفِ سیاہِ تو بہ دِل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

یہ دورِ شاعری کا ابتدائی دور ہے مگر غزل اس دور میں بھی پوری عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ غزل میں اردو کے تمام تہذیبی نمونے ملتے ہیں:۔

امرد پرستی

رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تلک بہلا
چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطّار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

تصوّف

جدا نہیں سب ستی تحقیق کر دیکھ
ملا ہے سب سے، اور سب سے نیارا

مثالِ بحر موجیں مارتا ہے!
کیا ہے جس نے اس جگ سے کنارا

مسافر اُٹھ تجھے چلنا ہے منزل
بجے ہے کوچ کا ہر دم نقّارا

زمانہ اور اہلِ زمانہ

گیا اخلاص عالم سے عجب کچھ دور آیا ہے
ڈرے ہے خلق ظالم سے، عجب کچھ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اُٹھ گئی ساری، عجب کچھ دور آیا ہے

دوسرے دور میں ہر چند کچھ بزرگ شعرائے نے اُردو کو فارسی پیوندوں سے صاف کرنے کی کوشش کی اور زبان و بیان میں بہت سی اصلاحیں بھی کیں۔ لیکن اس دور میں تقریباً وہی اثرات قائم رہے جو پہلے دور میں تھے۔ اس دور میں ایک طرح کا سُدھار پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے سادگیٔ بیان میں بھی فرق نمایاں ہونے لگا اور ابہام گوئی جو میرے خیال میں اسی دوہری تہذیب کا پَرتو تھی، جسے ہم ایرانی ہندی

تہذیب کہتے ہیں۔ شاعری کا جزو قرار پائی۔ اس دور میں بھی غزل اپنے معاشرے کی پوری پوری ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔ طوالت کے خیال سے مثال چھوڑتا ہوں۔

تیسرا دور جسے میر و میرزا کا دور کہتے ہیں ایک طرح سے اُردو شاعری کا سب سے شاندار دور ہے، کیا بلحاظِ زبان، کیا بلحاظِ مضامین اور کیا بلحاظِ اصنافِ سخن۔ اس دور میں غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ سبھی رُو بہ ترقی نظر آتے ہیں۔ شعرا میں میر، درد، سودا، قائم، مصحفی، انشا، ضاحک وغیرہ موجود تھے۔ یہ دور شاعری کی ہمہ جہت ترقی کا دور ہے۔ مگر سیاسی حالات روز بروز دِگرگوں ہیں، معاشی ناہمواری، مذہبی زوال آمادگی، اور طوائف الملوکی عام ہے، روہیلوں کی یلغاریں اور مرہٹوں کے حملے روز کا معمول ہیں۔ عوام و خواص دونوں زبوں حال ہیں۔ زندگی کی آسودگیوں سے محروم، اس معاشرے نے جو دُکھ دیئے ان کا اظہار ان شعرا کے کلام میں بدرجہ کمال ملتا ہے۔ میر، درد اور سودا نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق ان حالات کا اثر قبول کیا اور اپنے انداز میں اس کا اظہار کیا۔

صبا اکبرآبادی دو تہذیبوں کے آدمی ہیں۔ میر ہی کی شاعری کے عناصرِ ترکیبی سے انہوں نے ان تہذیبوں کی ترجمانی کی ہے۔ پہلی تہذیب نے جس میں وہ پیدا ہوئے انگریز کی غلامی میں پرورش پائی۔ پہلی جنگِ آزادی کو صرف اکیاون سال ہوئے تھے (صبا کا سنِ پیدائش ۱۹۰۸ء ہے) اور انگریز نے اس جنگ میں اپنی فتح کے بعد اس ملک کی ہر چیز کو بدل ڈالا، کیا سیاست، کیا تعلیم، کیا طرزِ معاشرت، کیا صنعت و حرفت اور کیا تجارت، اسے اس ملک کی دولت سے سروکار تھا اور بس۔ اُسے اپنے نظامِ حکومت کو چلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ وفادار کارندے درکار تھے۔ اُسے اپنے کلچر کو پھیلانے کے لئے نئے تہذیبی سانچے درکار تھے۔ وہ علم کی آڑ میں ایسی تعلیم رائج کرنی چاہتا تھا جو ذہنوں کو ہمیشہ کے لئے غلام بنا سکے۔ سیاسی آزادیوں کا گلا گھونٹ کر وہ ہر اُس آواز کو دبا دینا چاہتا تھا جو کسی مطالبہ کا تقاضا کرے۔ رسل و رسائل کے ذرائع کو اس نے اپنے مفاد کے لئے

ترقی دی۔ سڑکیں، ریلیں، پل، ہوائی اڈے، آرڈیننس فیکٹریاں، دفاتر، چھاؤنیاں،
بڑے بڑے کارخانے، غرض ہر چیز کو اس نے اپنے مفاد کے لئے ترقی دی چنانچہ
اس تہذیب میں احترامِ آدمی ناپید ہوا، استحصال کے نئے نئے راستے کھلے،
محرومی کا احساس شدید سے شدید تر ہو گیا۔ معاشی ناہمواری عام ہوئی، معاشرتی
برائیوں نے نئی نئی صورتیں اختیار کیں، کساد بازاری نے جنگِ زرگری کے نئے
نئے محاذ کھولے اور اس طرح شرافت و ثقاہت کے سارے قرینے برباد ہو گئے۔
اور انسان ایک ایسے کرب میں مبتلا ہو گیا جس کا تریاق عراق میں بھی میسّر نہ آسکے۔

اس تہذیب کے دردناک اثرات کی شدت کو کم کرنے میں تصوّف بڑا معاون ثابت ہوا
ہر چند تصوّف بھی ظاہر پرستی میں ملوّث تھا لوگوں نے عشق مجازی میں بھی اپنی
تسلّی اور سکون کی راہیں تلاش کر لیں۔ شکوۂ روزگار و ابنائے روزگار سے
بھی لوگوں نے جی کی بھڑاس نکالی اور اس طرح دردمندی میں آسودگی کے
پہلو تلاش کئے۔ کم و بیش یہی وہ میر کی شاعری کے عناصرِ ترکیبی ہیں جو صبا
کی غزل میں صاف نظر آتے ہیں۔ وہ حسّاس دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے،
کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے گرد و پیش سے آنکھیں چرا لیتے۔ انہوں نے اپنے معاشرہ
کی ترجمانی نہایت صداقت کے ساتھ کی ہے اور اس ترجمانی کے حسین نمونے
ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ان کا لہجہ شائستہ، پُر وقار اور نرم و ملائم ہے۔

غمِ جاناں اور غمِ جان دونوں کے اظہار میں ان کے یہاں متانت اور
سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ ان کے استعارے اور تشبیہات ابداع کے نادر نمونے
ہیں۔ نئے مضامین کی تلاش ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ انہوں نے ایک لاکھ
سے زیادہ شعر کہے ہیں اور اس پر گوئی کے باوجود کیف و اثر میں کہیں ذرا سی بھی کمی
نہیں۔ یہ بڑے کمال کی بات ہے۔ اکثر پُر گو شعرائے کے یہاں سوائے الفاظ
کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

آئیے ان کے کچھ اشعار پڑھیں، ان شعروں میں وہ تمام محاسن ملیں گے
جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

؎ ظاہر جو اُن پہ مرتبۂ آدمی کریں
جتنے بنے ہوئے ہیں خدا بندگی کریں

؎ کسی بندے کی خدائی ہو تو اُس سے پوچھیں
کتنے دن لگتے ہیں بندے کو خدا ہونے تک

؎ کانپ جاتا ہے اہرمن بھی صبا!
آدمی جب خراب ہوتا ہے!!

؎ لے ترے نقشِ کفِ پا کی امانت دے دی
سجدۂ اک قرض جبیں پر تھا ادا ہونے تک

میرؔ نے اس کرب کے اظہار کے لئے نالہ و شیون کا راستہ اختیار کیا اور اس طرح اپنے دل کو سکون سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔

دردؔ نے خانقاہ اور تصوّف میں ان دُکھوں کا مداوا ڈھونڈا اور صوفیانہ مضامین کے اظہار میں کچھ تسلّی اور تشفّی پائی۔

سوداؔ نے اس کرب کا اظہار دوسری طرح کیا۔ انھوں نے روزگار اور ابنائے روزگار کو اپنے طعن و تشنیع کا ہدف بنایا اور زندگی کی تلخیوں کو اپنے لہجہ کے طنطنہ سے کم کیا۔

میرؔ، دردؔ اور سوداؔ کا یہ انداز سخن اور اظہار و بیان، جو اپنے معاشرے کا پورا ترجمان ہے آج تک قائم ہے اور ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا ہے، کیونکہ اس دور میں بھی زندگی شائد زیادہ ناآسودہ اور غیر مطمئن ہے۔ اخلاقی پستی، ذہنی انتشار، معاشی اور معاشرتی ناہمواری اور دوسری برائیاں معاشرہ میں اُسی طرح جاری و ساری ہیں اور اسی لئے ان بزرگوں کی پیروی ہماری غزل کا مزاج بن گئی ہے۔
میرؔ کا انداز سخن مختلف شعرائے سے ہوتا ہوا فانیؔ، فراقؔ اور صباؔ تک پہنچتا ہے۔

درد کی صوفیانہ شاعری کا پرتو یوں تو ہر شاعر کے یہاں تھوڑا بہت ضرور نظر آتا ہے لیکن اصغر گونڈوی کی غزل میں یہ زیادہ نکھر کر سامنے آیا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی اور زیادہ نکھرے ہوئے انداز میں حالی، اقبال اور جوش اور غزل میں یگانہ کے یہاں سودا کا اسلوبِ سخن صاف نظر آتا ہے، وہی لہجہ میں گھن گرج، وہی طنطنہ اور وہی اظہار و بیان میں مردانگی۔

آتش، ناسخ، غالب، ذوق اور مومن کی شاعری بھی اپنے دور کی ترجمان ہے، خاص کر غالب مٹتی ہوئی عظمت اور دم توڑتی ہوئی تہذیب کی ترجمانی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

داغ اور امیر کے زمانے میں طوائف، معاشرہ کا ایک اہم رُکن تھی۔ وہ تہذیب و شائستگی کی معلم سمجھی جاتی تھی اور طوائف رکھنا شرافت اور امارت کی علامت تھا چنانچہ اس دور کی غزل بھی چوما چاٹی کی غزل ہے۔

دورِ حاضر میں بھی غزل اپنے تمدن کی پوری طرح ترجمان ہے۔ اس دور میں قدیم اور جدید کے تصادم اور کشمکش سے اقدار کی جو شکست و ریخت ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ہماری تہذیبی شناخت مبہم مبہم ہے اور یہی ابہام ادب میں بھی نظر آتا ہے۔ خاص طور پر ہماری جدید غزل اس ابہام بلکہ بسا اوقات اہمال سے دوچار ہے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ صبا اکبر آبادی میر کے قبیلہ کے فرد ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اکبر آبادی ہونے کے ناطے سے میر سے ہی کیا بلکہ غالب سے بھی ان کا وطنی رشتہ قائم ہے۔ اور اس رشتہ کا اظہار وہ میر کی زمینوں میں شعر کہہ کر اور میر کی عظمت کے حوالے سے کرتے ہیں:

اے صبا پیروئ میر بہت ہے دشوار
ہاں مگر حوصلہ پیروئ میر تو ہے!

میر صاحب بتا گئے سب کو
تیرے لب کی جو نازکی ہے میاں

اور اس شعر میں تو انہوں نے پورا آگرہ اسکول جمع کر دیا ہے:

وہی زباں جو صبا غالب اور میر کی تھی
دیارِ شعر میں سکے اُسی زباں کے چلے

ہوس کی راہ بھی تھی کوچۂ فریب بھی تھا
بچا کے لائی محبت کہاں کہاں سے مجھے

پھولوں کی روشنی میں نشیمن ہوئے تباہ
لوٹا چمن چراغ جلا کر بہار نے

پارسائی تیرے رستے میں ہیں کتنے مرحلے
دو قدم چلتا ہوں مل جاتا ہے میخانہ مجھے

بلند رہ کے ہمیں خاک میں ملاتا ہے!
یہ آسمان جو ملتا نہیں زمیں سے کہیں

بے طلب مل رہی ہے دولتِ غم
میری صورت سوال ہے شائد!

بھیڑ تنہائیوں کا میلا ہے!
آدمی آدمی اکیلا ہے!

یہ فخرِ حیات کم نہیں ہے!
ہر حال میں آدمی رہا ہوں

ان کو یوں دیکھنا جیسے کبھی دیکھا ہی نہ ہو
بڑی مشکل سے یہ تہذیب نظر آتی ہے

ساری دنیا سے دوستی کر لے
جس کو رہنا ہو عمر بھر تنہا!

ان اشعار میں آپ کو انسانی رشتوں کے حوالے، معاملاتِ حسن و عشق کی پاکیزگی، زندگی کی بھرپور تمنّا، جذبوں کی سچائی، غرض ہر وہ چیز ملے گی جو عمدہ اور سچّی غزل کی بنیاد ہے۔ اب اس تہذیب کی طرف آئیے جس میں صبا اکبر آبادی آجکل زندہ ہیں۔ اس تہذیب کے خدّوخال ایک طرح سے یکسر بدلے ہوئے ہیں۔ انسانی شعور کی بیداری کے لئے محرّکات کی غیر معمولی اُرزانی ہے۔ ابلاغِ عام کے وسائل پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ سائنس کی ایجادات نے انسانی زندگی کو زیادہ سہل لیکن انسان کو زیادہ خوفزدہ کر دیا ہے۔ نئے نئے علوم کی تلاش میں آدمی سیاروں اور ستاروں میں سرگرداں ہے۔ فلسفہ کی موشگافیوں نے اُسے نفسیاتی بیمار بنا دیا ہے۔ انسانی رشتوں کے ٹوٹنے سے تنہائی کا کرب اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ اقدار کی شکست و ریخت سے اس کی تہذیبی شناخت مسخ ہو گئی ہے۔ شائستگی کے ڈانڈے اخلاق و کردار سے ٹوٹ چکے ہیں۔ مذہب کی تاویلات نے اسے بے اعتبار کر دیا ہے۔ سیاسی آزادیوں نے اسے کا گلا گھونٹ دیا ہے، غرض آدمی کے لئے اتنی بڑی دنیا میں کہیں جائے اماں نہیں۔

اس تہذیب کے خدّوخال بھی صبا اکبر آبادی کی شاعری میں واضح اور نمایاں ہیں۔ انہوں نے نئے نئے اسالیب سے ان کا اظہار کیا ہے اور ہر قدم پر اپنی غزل کی سچائی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

ایک دیوانے کے نہ ہونے سے!
کتنا ویران ہو گیا ہے شہر

یہ سہارا بھی مری بے اثری نے توڑا
دل سمجھتا تھا کہ فریاد میں تاثیر تو ہے

دل کا احوال سرِ بزم سُنا دیتے ہیں
ہم نگاہوں کو بھی آواز بنا دیتے ہیں

حُسن صحرا کو ترے آبلہ پا دیتے ہیں
پاؤں رکھتے ہیں جہاں پھول کھِلا دیتے ہیں

ہے گدائی میں بھی پندارِ گدائی شامل
بند جو در ہو اسی در پہ صدا دیتے ہیں

بس اتنا واسطہ ہے کارواں سے
لُٹا ہوں، میں نے کچھ لُوٹا نہیں ہے

بلندی سے اُسے گِرنا پڑے گا!!
جو چشمہ خاک سے پھوٹا نہیں ہے

تمہیں سو رُخ نظر آئیں گے اپنے
میں آئینہ ہوں اور ٹوٹا ہوا ہوں

جب چلے تو ساری دُنیا راہ میں حائل ملی
دل سے دل تک اک نظر کا فاصلہ سمجھے تھے ہم

اے دل اسیرِ حلقۂ دیوار و در نہ ہو
دنیا بہت بڑی ہے نہیں ہے جو گھر نہ ہو

آہستہ چلو زیرِ قدم آگ نہ لگ جائے
سبزے کیلئے گرمیٔ رفتار بہت ہے

اب ہے شام ہجر یا صبح فراق
زندگی سے روز و شب جاتے رہے

ہر شہر کو میں سمجھ کے اپنا
ہر شہر میں اجنبی رہا ہوں!

آپ نے دیکھا کہ اس تہذیب کی ترجمانی بھی صبا اکبر آبادی نے کس خوبصورت انداز سے کی ہے اور اس طرح ان کی شاعری دو تہذیبوں کا سنگم ہے۔ قدیم اور جدید دونوں کے دھارے ان کی غزل میں بہتے نظر آتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ صبا اکبر آبادی کی شاعری کا اس طرح اب تک جائزہ نہیں لیا گیا جس طرح اعلیٰ درجہ کی شاعری کا لیا جاتا ہے۔ غزل کے مطالعے میں یا تو بعض لوگوں کی شاعری کو اور بعض ادوار کی شاعری کو ہم یکسر رد کر دیتے ہیں یا اُس شاعری کے ایک بڑے حصّے سے ہم صرفِ نظر کر جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ ہمیں شعر کو اُسی دور کے تناظر میں رکھ کر پڑھنا اور سمجھنا چاہیئے جس دور میں وہ کہا گیا ہے۔ یقین ہے کہ صبا اکبر آبادی کی شاعری کا جائزہ ضرور لیا جائے گا۔ اور اُن کو اُن کا وہ مقام ضرور ملے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔

محمدّ ذاکر علی خاں کا رختِ سفر

عربی لُغت میں نعت کے معنی ہیں اچھی اور قابلِ ستائش صفات کا کسی شخص میں پایا جانا، جیساکہ عربی کے اس فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے۔"نعت الرَّجُل" یعنی اس شخص میں بہترین خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح فارسی میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیساکہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

جاوید ہمیں باشں بہ ایں نعت بہ ایں وصف
پاکیزہ بہ اخلاق و پسندیدہ بہ افعال

اب فارسی اور اردو میں نعت کی اصطلاح صرف اور صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح اور توصیف کے لئے مخصوص ہے۔ نعت کی اصطلاح کسی ہیئت سے مخصوص ومنسوب نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صرف موضوع ہے، نعت تو قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مسدّس غرض ہر ہیئت میں یہاں تک کہ نثر میں بھی کہی جاسکتی ہے۔

مسلمان اپنے عقائد لے کر دنیا میں پھیل گئے اور اپنے عقائد کے ساتھ جہاں جہاں بھی گئے وہاں کے مقامی اثرات مثلاً ان کے معاشرتی اور تہذیبی اثرات کو انہوں نے بھی قبول کیا لیکن جس چیز نے ان کو ممتاز و ممیز رکھّا۔ وہ عقیدۂ توحید ورسالت تھا اور یہ وہ عقیدہ تھا جس کے اعلان اور اظہار کے بغیر وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے تھے۔ دوسرے مذاہب میں بھی جزوی طور پر ہی سہی توحید کا عقیدہ موجود تھا مگر رسالت کے تصوّر سے وہ نا آشنا تھے، اور اس طرح کا کوئی عقیدہ ان کے اعتقادات کا جزو نہیں تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک توحید کے ساتھ ساتھ عقیدۂ رسالت پر صرف ایمان لانا ہی ضروری نہیں تھا بلکہ رسولؐ کی ذات وصفات سے والہانہ محبت بھی جزوِ ایماں اور لازمۂ زندگی تھی کیونکہ رسالت پر ایمان لائے بغیر اور رسولؐ سے محبت کئے بغیر عقیدہ توحید کمزور اور

بے معنی ہو جاتا ہے اور اسی محبت کے اظہار اور اسی عقیدہ کے بیان کا نام شاعری کی اصطلاح میں نعت ہے۔

نعت کا موضوع بظاہر نہایت مختصر نظر آتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ موضوع نہایت وسیع اور مشکل موضوع ہے، وسیع اس لحاظ سے کہ اس میں رسول اللہؐ کی ذات وصفات کے حوالے سے ہمارے تمام تہذیبی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی پہلو آجاتے ہیں اور مشکل اس لحاظ سے ہے کہ عقیدۂ توحید کی حدود میں رہ کر رسول کی ذات وصفات کا احاطہ کرنا اور احترامات رسولؐ کو انسانی رشتوں کے حوالوں سے ملحوظ رکھنا دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

عربی میں نعت کے اشعار بعثت کے آغاز ہی سے ملتے ہیں، حضرت ابوطالبؑ کے نعتیہ اشعار غالباً عربی کی پہلی نعت ہیں۔ بعض نعتیہ اشعار حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی منسوب ہیں اس کے علاوہ بے شمار صحابہ ہیں جنہوں نے نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ ان میں حضرت حسان بن ثابت حضرت عبداللہ بن رواحہ، اصید بن سلمۃ السلمی، حضرت مالک بن الخط، حضرت ماذن، حضرت کعب بن زہیر، اور حضرت کعب بن مالک وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عہدِ صحابہ اور اس کے بعد اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی پھیلتی گئی اور عرب کے علاوہ بھی دنیا کے دوسرے حصّوں میں عربی میں نعتیہ اشعار بے شمار کہے گئے ان میں اور شعراؑ کے علاوہ علامہ بوصیری کا قصیدۂ بُردہ نہایت مشہور ہے حالانکہ یہ قصیدہ پہلا قصیدہ بُردہ نہیں ہے پہلا قصیدۂ بُردہ حضرت کعب بن زہیر کا ہے۔

فارسی میں شعر و شاعری کی ابتداء نعت رسول مقبولؐ سے نہیں بلکہ "مدیح کے وجہ" سے ہوئی، فارسی میں سب سے پہلا قصیدہ مامون الرشید کی مدح میں عباس روزی نے کہا چنانچہ خود وہ دعویٰ کرتا ہے ؎

کس برایں منوال پیش از من چنیں شعرے نہ گفت
مرزبانِ فارسی راہست تا ایں نوع ، بیں

لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت
گیرد از مدح و ثنائے حضرتِ تو، زیب و زین

اس کے بعد فارسی کے بے شمار شاعروں نے قصیدہ گوئی میں نام پیدا کیا مگر ان کے کلام میں نعت گوئی کے نمونے نہیں ملتے۔

فارسی میں نعت گوئی کی ابتدا بہت بعد کو ہوئی اور پھر تو ایسی نعتیہ شاعری ہوئی کہ ادب کا دامن نعت کے اشعار سے بھر گیا۔ ان شعرا میں ابوالفرج رونی، اوحدالدین انوری، سعدی شیرازی، مولانا روم، عبدالرحمٰن جامی، عرفی شیرازی اور قاآنی غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ اردو کے نعت گو شعرا میں غلام امام شہید، کرامت علی خاں شہیدی، امیر مینائی، محسن کاکوری، شاہ نیاز بریلوی، احمد رضا خان، حسن رضا خاں، حالی، ظفر علی خاں، بیدم وارثی، اکبر وارثی، علامہ اقبال، دِلورام کوثری، حفیظ جالندھری، سہیل عظیم آبادی، مولانا ضیا القادری، ماہر القادری، عبدالعزیز خالد، حافظ لدھیانوی، اعظم چشتی، عبدالکریم ثمر اور حفیظ تائب قابلِ ذکر ہیں، یوں تو کسی زبان کا شائد ہی کوئی مسلمان شاعر ہو گا جس نے نعت نہ کہی ہو۔

فارسی اور اُردو کے نعت گوئی کے ابتدائی دور کے شعرا نے صرف رسول مقبولؐ کے حلیہ، واقعہ معراج اور معجزات ہی سے اپنی نعتوں کا مواد حاصل کیا مگر افکار و خیالات کی ترقی کے ساتھ ساتھ نعت کے مضامین اور موضوعات میں بھی تبدیلی آتی گئی اور اب اخلاقِ نبویؐ اور صفاتِ نبویؐ کا بیان بھی ہونے لگا اور اس بیان میں رسول اللہ کے روزمرہ کے معمولات، یعنی آپ کے حُسنِ عمل، حُسنِ خُلق، حُسنِ معاملت، عدل و انصاف، شفقت و رافت غرض حضورؐ کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو نعت کا موضوع نہ بنا ہو۔ دنیا کا کوئی انسان ایسا نہیں جس کی تمام صفات کا احاطہ اس طرح ادب میں کیا گیا ہو اور جس کے تمام معمولاتِ زندگی کو محفوظ کر لیا گیا ہو۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ نعت گوئی نہایت مشکل صنفِ سخن ہے، اس سلسلے میں بعض شاعروں نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو نعوذ باللہ یا تو کنگھی چوٹی والا معشوق بنا ڈالا یا ان کی توصیف و ثنا کے ڈانڈے شرک سے ملا دیئے اور عقیدتمندوں نے بعض عاشقانہ بلکہ بقول مولانا حسرت موہانیؒ "فاسقانہ" غزلوں کو نعت کے خانے میں ڈال دیا مثلاً خسرو کی یہ غزل ؏

نمی دانم چہ منزل بُود شب جائیکہ من بُودم

جس میں اس طرح کے اشعار ہیں ؎

پری پیکر، نگارے، سرو قدّے، لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود، شب جائیکہ من بُودم

رقیباں گوش بر آواز، اُو در ناز، من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بُود شب جائیکہ من بودم

صرف مقطع میں نعت کا اشارہ ہے ؎

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد ﷺ شمعِ محفل بود، شب جائیکہ من بودم

خسرو کی یہ غزل ان کے کسی مروّجہ دیوان میں نہیں ہے، اسی طرح بعض الحاقی نعتیں مشہور شعرائے کے نام سے منسوب ہیں، مثلاً جامی کے نام سے یہ نعت نہایت مشہور ہے ؎

نسیما جانبِ بطحا گذر کن

ان کے کلیات مطبوعہ ایران میں یہ نعت نہیں ہے۔

جامی کی ایک نعت کا مطلع ہے ؎

روحی فداک یا صنمِ الطبی لقب　　آشوبِ ترک، شورِ عجم، فتنۂ عرب

ہر چند کہ فارسی میں "صنم" کا لفظ محبوب کے معنی میں مستعمل ہے لیکن رسولؐ کے لئے اس کا استعمال ہر لحاظ سے محلِ نظر ہے، پھر آشوبِ ترک، شورِ عجم، فتنۂ عرب کہنا کہاں تک درست ہے عربی میں فتنہ کے معنی کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن فارسی اور اردو میں مروّجہ معنی ہی مراد ہوں گے، اسی طرح ایک اردو شاعر کا یہ کہنا ؎

اللہ کی جھولی میں وحدت کے سِوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے

صرف یہی کہا جا سکتا ہے ؏ خطا بر بزرگان گرفتن خطا است، اردو شاعری سے ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

مولانا روم نے اپنی مثنوی میں حضرت موسیٰ اور ایک چرواہے کا قصہ بیان کیا کہ چرواہا اللہ تعالیٰ کو اپنی محبوبہ تصوّر کر کے اُس سے عجیب عجیب باتیں کیا کرتا تھا، حضرت موسیٰ نے اس کی ان باتوں پر اس کی ملامت کی مگر اللہ تعالیٰ کو حضرت موسیٰ کی یہ بات پسند نہ آئی اُسے تو اُسی چرواہے کی باتیں پسند تھیں، چنانچہ حضرت موسیٰ کو تنبیہہ ہوئی ؎

تو برائے وصل کردن آمدی　　　　نے برائے فصل کردن آمدی

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ

محبت کی زبان عجیب ہوتی ہے، نہ الفاظ کا در و بست ٹھیک ہوتا ہے نہ تخاطب کے آداب درست ہوتے ہیں، نہ موقع محل کا لحاظ ہوتا ہے، نہ لہجہ صحیح ہوتا ہے غرض دل سے نکلی ہوئی باتیں جذبے اور احساس کی شدت میں صرف اظہار چاہتی ہیں۔ اور اس اظہار میں زباں دانی کے تمام کُلّیے اور قاعدے مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن مخاطب جس سے ہم کلام ہے وہ اس کی زبان خوب سمجھتا ہے اور اس کے جذبات و احساسات سے پوری طرح آشنا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مخاطب کا مقصود و منشا کیا ہے، سوز و گداز کے کن کن مرحلوں سے روح گذر رہی ہے، ذہن کو فکر و خیال کی کن منزلوں کا سامنا ہے، ہجر کی درد سامانی

نے آتش شوق کو کس حد تک تیز کیا ہے، وصال کی کن کیفیات نے روحانی لذت حاصل کی ہے، غرض محبت کے تمام قرینوں کے اظہار کا طریقہ کچھ بھی ہو نہایت سادہ اور پُرکار ہوتا ہے۔

یہ تو عام محبت کا ذکر تھا لیکن جب یہ محبت اور اس کا اظہار دنیا کی عظیم ترین ہستی سے ہو تو اس کے قرینے بھی بدل جاتے ہیں، ہستی بھی وہ جو سردار الانبیاءؑ ہے، جو محبوبِ خدا ہے، جو رؤف ورحیم ہے، جو سراج المنیر ہے، جو شاہد و مبشّر ہے، جو مُزّمل ہے، جو مُدثّر ہے، جو یٰسین وطٰہٰ ہے جو دعائے خلیل ونویدِ مسیحا ہے، جو رحمت اللعالمین ہے، جو شفیع المذنبین ہے، جو یتیموں اور بیواؤں کا ملجا وماویٰ ہے، جو مُزکّی ومُعلم ہے، جو بشیر ونذیر ہے، جو مجتبیٰ اور مصطفیٰ ہے، جو صادق وامین ہے جو عبدِ کامل ہے، جو صاحبِ کوثر ہے، جس کا اسم گرامی احمدؐ اور محمدؐ ہے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ رسول اکرمؐ سے محبت جزوِ ایمان ہے مگر اس محبت کے اظہار میں "باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار" کا لحاظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ زبان کیسی ہی کج مج ہو، اظہارِ خیال کے پیمانے کتنے ہی کمزور سہی، الفاظ کا دروبست کیسا ہی کم مایہ سہی، مگر احترامات رسولؐ ہمیشہ پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔

جناب ذاکر علی خاں بھی رسولِ مقبولؐ کے شیدائیوں میں سے ہیں، انہیں رسول اللہؐ سے جو والہانہ محبت ہے اس کا اظہار ان کی زندگی کے اکثر معمولات سے ہوتا ہے، رسولؐ کے تذکار کی کوئی محفل ہو نعت کی کوئی بزم ہو، یا دورانِ گفتگو میں رسول اللہ کا ذکر آجائے تو ان کی روح ایک جھرجھری لیتی ہے، چہرہ فرطِ جذبات سے سُرخ ہوجاتا ہے اور آنکھیں جوشِ عقیدت سے ایک چمک کے ساتھ شبنمی ہوجاتی ہیں۔ ان کی یہ کیفیات کم از کم میرے لئے قابلِ رشک ہیں، اسی محبت اور عقیدت نے جو رسول اکرمؐ سے ان کو ہے نعتیہ شعری مجموعہ "رختِ سفر" کی صورت اختیار کرلی ہے، وہ باقاعدہ شاعر نہیں ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ اس کا ان کو دعویٰ بھی نہیں، مگر وہ جذبات اور محسوسات کے اظہار میں پکے شاعر ہیں، اپنے ان عقیدتمندانہ محسوسات کو جس سچائی، سادگی اور متانت سے

وہ بیان کرتے ہیں اُس میں تاثیر اور تاثر کا عنصر غالب ہے اور گداز دل اور روح کے سوز کا یہ ابلاغ جو دوسروں کے لئے بھی نفس کی پاکیزگی اور خیالات کی طہارت کا سامان فراہم کرتا ہے انہیں یقیناً شاعر کے منصب پر فائز کرتا ہے، شاعری کیا ہے از دل خیزد بر دل ریزد۔

آئیے ان کے کچھ اشعار پڑھیں ؎

چشمِ کرم سے جس کی ترا سنگِ در ملا
دیتا رہوں گا اس کو دعائیں میں صبح و شام
ذاکر ہو ذکرِ خیر ہمہ وقت اس طرح
صلِّ علیٰ کا ورد ہو، ربِّ العُلیٰ کا نام
ترے پیغام کو پہنچایا اُس نے
بڑا صادق بڑا سچا امیں ہے
ترا یہ گھر کیا ہے جس نے آباد
ہے اس پر آفریں صد آفریں ہے

یہ اشعار حمد کے اشعار تھے ان میں بھی ذاکر علی خاں نے نعتِ رسول مقبولؐ کے پہلو اجاگر کر رکھے ہیں۔ نعت میں ان کی محبت کا انداز نہایت والہانہ ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

خوشا فراق، یہ بیچارگی کا عالم ہے
عجیب اُس سے تکتا ہوں جانے والوں کو
جائیں تو یوں جائیں مدینے!
جا کر ہم رہ جائیں مدینے
دل کا ابھی سے حال نہ پوچھو
پہلے ہم ہو آئیں مدینے!!
دل ہے معمور خوشی سے نہیں تھمتے آنسو

پھر درِ صاحب لولاک لما یاد آیا

میں اکیلا ہی چلا سوئے مدینہ ذاکر

رہنماؤں کا مجھے راہنما یاد آیا

دل کا پیغام ملا ہے یہ کئی بار مجھے

پھر بلاتے ہیں مدینے مرے سرکار مجھے

تھی سلام شوق کی آرزو، وہاں لے گئی جو کشاں کشاں

مجھے یاد سب ہیں عنائتیں، مرا الفرشوں پہ بھی دھیان ہے

بڑھا ہے اور ہی کچھ اضطراب کا عالم

سنہری جالیاں روضہ کی جب سے تھام آیا

سب تمناؤں کے ارمانوں کے نذرانے لئے

اِک بھکاری بھی چلا بننے کو مہمانِ رسول ؐ

جہاں میں تیرے کرم کی سبیل جاری ہے

ستم زدوں کے، غریبوں کے غمگسار سلام

لگی میں دل کی بجھانے سلام لایا ہوں

اور اس سلام میں کتنے پیام لایا ہوں

وہ داستاں جسے اوروں سے کہہ نہیں سکتا

تمہیں سنانے کو خیر الانام لایا ہوں

مُنہ چوم لیا میرا فرشتوں نے یہ سُن کر

مالک مرا اللہ ہے ایمان محمد ؐ

ان اشعار میں سچے اور سیدھے سادھے دلی جذبات کا اظہار نہایت معصومانہ انداز میں کیا گیا ہے، نہ تشبیہہ واستعا کی مرصع کاری ہے نہ فصاحت و بلاغت کی پردہ داری محبت اور عقیدت کے پاکیزہ جذبوں نے شعر کا پیرایہ اختیار کرلیا ہے اور بس، بارگاہِ رسالت ؐ میں یہ جذبات یقیناً مقبول ہیں ورنہ ذاکر علی خاں کو روح کا یہ سوز اور یہ دلِ دردمند میسّر نہ آتا۔

مرثیہ نگاری میں اثر جلیلی کا مقام

مرثیہ ــــ وہ نظم ہے جس میں کسی شخص کی موت پر حسرت وغم کا اظہار کیا جائے اور مرنے والے کی خوبیاں اور اوصاف بیان کیئے جائیں۔

اردو میں عام طور پر مرثیہ کا لفظ شہادت اہلِ بیت ہی کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے، لیکن دراصل مرثیہ صرف واقعاتِ کربلا کے بیان سے مخصوص نہیں ہے، دوسروں کے مرنے پر بھی جو نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ان کو بھی مرثیہ ہی کہتے ہیں، لیکن اب اردو شاعری میں مرثیہ سے مراد صرف واقعاتِ کربلا کا بیان ہے۔

عرب میں شاعری کا آغاز فخریہ نظموں سے ہوا، ان نظموں میں وہ اپنے بہادروں کے کارنامے بیان کرتے اور اس کے ساتھ وہ ان نظموں میں ان کی موت پر اظہار افسوس بھی کرتے اور چونکہ اہلِ عرب کی زندگی تصنع سے پاک تھی اس لیئے ان کی ان نظموں میں بھی سچائی اور جوش وجذبہ ہوتا جو دل پر نہایت اثر کرتا اور اس طرح ان فخریہ نظموں کی ایک شاخ مرثیہ بھی قرار پائی۔ عرب کی شاعرات میں خنسا کے مرثیے نہایت مشہور ہیں۔

عرب میں واقعہ کربلا کے متعلق مرثیے شاذونادر ہی ہیں، وہ دور چونکہ بنی اُمیہ کا دور تھا اس لیئے حکومت کے خوف سے لوگ عام طور پر اپنے اندوہ وغم کے جذبات کا اظہار کھلے بندوں نہ کرسکے ہوں گے۔ اور ایران اور ہندوستان میں جس طرح محرم منایا جاتا ہے اور جس طرح مجالس کا انعقاد اور مرثیہ خوانی ہوتی ہے۔ یہ عرب میں کبھی نہیں ہوا۔ اس لیئے جس طرح ہندوستان میں واقعہ کربلا کے ایک ہزار سال بعد مرثیے لکھے گئے یہ صورت اہلِ عرب کو کبھی پیش نہیں آئی۔

فارسی شاعری جس زمانہ میں شروع ہوئی وہ زمانہ مرثیہ نگاری کے لیئے موزوں

نہ تھا کیونکہ مرثیہ اور غزل ہی ایسی اصناف ہیں جن کا کوئی صلہ یا انعام نہیں ہے، فارسی شاعری کے آغاز اور عروج کے زمانے میں ملکی انقلاب اور شخصی حادثات کتنے ہی پیش آئے لیکن فارسی میں شہر آشوب اور مرثیے برائے نام ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ستائش اور صلہ کی کوششیں زیادہ تھیں اور درباروں کی باریابی کو لوگ اپنے لئے زیادہ منفعت بخش سمجھتے تھے۔ فارسی کا پہلا مدحیہ قصیدہ مامون الرشید کا عباس مروزی نے لکھا

پھر بھی فارسی مرثیہ سے بالکل خالی نہیں۔ شعر العجم میں علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ فارسی میں فرخی سے پہلے مرثیہ کے اشعار بہت کم پائے جاتے ہیں اور جو ہیں بھی وہ بہت معمولی درجے کے ہیں۔ لیکن فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ نہ صرف پُر تاثیر ہے بلکہ اس فن کے تمام اُصول اور آئین اس سے قائم ہو سکتے ہیں۔

مرثیہ نگاری کے بڑے بڑے اصول یہ ہیں۔

۱۔ ممدوح کی عظمت اور شان کا ذکر کرنا تاکہ عبرت حاصل ہو کہ اس پایہ اور مرتبہ کا شخص دنیا سے اُٹھ گیا۔

۲۔ اس کے مرنے سے جو رنج و غم اور ماتم برپا ہوا اس کا ذکر۔

۳۔ اس کو مخاطب کر کے ایسے خیالات ظاہر کرنا جس سے ظاہر ہو کہ مرنے والے کی موت کا یقین نہیں ہے بلکہ وہ زندہ ہے۔

فرخی کے بعد خلیفہ مستعصم باللہ کا سعدی کا مرثیہ مشہور ہے جس کا مطلع یہ ہے

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین!

یہ عجیب بات ہے کہ فارسی شاعری کے آغاز یعنی سنہ ۸۰۰ء سے تقریباً چھ سات سو برس تک، ایران میں بھی شہادتِ عظمیٰ کے مرثیے نہیں لکھے گئے، سلاطینِ صفویہ کے زمانے میں مرثیہ نگاری کا آغاز ہوا یعنی طہماسپ صفوی کے حکم سے پہلے محتشم کاشی نے اپنا بے نظیر مرثیہ لکھا جو اپنی خوبیوں کے لحاظ سے پہلا اور آخری ہے اس کے بعد

محسن کاشی، ظہوری اور مقبل وغیرہ نے مرثیے لکھے اور اس کو ایک مستقل صنفِ شاعری بنا دیا۔

ہمارا اصل مقصد اردو مرثیہ ہے، غالباً سب سے پہلا مرثیہ نگار محمد قلی قطب شاہ ہے، لیکن دکن میں سولہویں صدی تک جو مرثیے لکھے گئے انہیں خالص اردو مرثیہ نہیں کہا جاسکتا وہ دکنی اردو کے مرثیے ہیں۔

دکن کی طرح دلی میں مرثیے نہ لکھے جانے کا سبب یہ ہے کہ یہاں کے بادشاہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہوں کی طرح شیعی نہیں تھے، پھر بھی دلی میں مرثیہ گو شاعر پیدا ہوئے ان میں سب سے پہلے فضلی ہیں جن کی کربلا کتھا یا دہ مجلس مشہور ہے اور ان کے ہمعصر اماقی، آبرو اور عاصمی ہیں اماقی میر انیس کے اجداد میں سے ہیں، ان کے بعد مسکین، سکندر اور گدا ہیں۔

سودا نے قصیدہ کی صورت میں بھی مرثیے کہے ہیں اور ترجیع بند، ترکیب بند، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، اور مستزاد کی صورت میں بھی، میر تقی میر نے بھی سلام اور مرثیے کہے ہیں ان میں سودا کی طرح مضمون آفرینی اور جدت طرازی نہیں ہے مگر سودا سے زیادہ پُر تاثیر اور پُر سوز ہیں۔

لکھنؤ کے شعرا میں سودا اور میر کے بعد درخشاں اور صابر وغیرہ نے بھی مرثیے کہے ہیں، لکھنؤ کے شعرا میں میر ضاحک اور ان کے بیٹے میر حسن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، صرف اس وجہ سے نہیں کہ انھوں نے فنِ مرثیہ گوئی میں کوئی ترقی کی ہے بلکہ ان کے شعری خصائص ان کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوئے اور میر حسن کے بیٹے میر خلیق نے فن مرثیہ گوئی میں اضافے کئے اور اس کو ترقی دی اور میر خلیق کے بیٹے میر انیس نے تو زمینِ مرثیہ کو آسمان سے بھی زیادہ بلند کر دیا۔

میر خلیق کا کلام مفقود ہے لیکن ظاہر ہے وہ میر حسن کے بیٹے تھے ورثہ میں نہ صرف جوہر شاعری ملا تھا بلکہ سوز و گداز بھی باپ سے پایا تھا، جو کلام ان کے نام سے منسوب ہے نقادوں کو اس میں تامل ہے، اس کے باوجود میر خلیق کا نام مرثیہ گوئی کے فن میں

نہایت معتبر اور مقتدر نام ہے، میر خلیقؔ کے ہمعصر میر ضمیرؔ کو یہ فخرِ اولیّت حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے علم، فطری صلاحیت اور جودتِ طبع سے مرثیہ کو ایک مستقل فن بنا دیا، اُن سے پہلے نہ مرثیہ کی بحریں مخصوص، نہ نظم کی کوئی خاص قسم، نہ مرثیے کے اجزا مقرّر تھے، نہ مضامین میں کوئی وسعت تھی، صرف اہلِ بیت کی یاد اور ان کے مصائب کا ذکر مجلس میں ہوتا تھا اور مرثیے پچیس ۲۵ تیس ۳۰ بندوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے، مرثیہ میں چہرہ اور سراپا میر ضمیرؔ ہی کی ایجاد ہے، مرثیہ کو رزمیہ نظم کی صورت بھی انہوں نے ہی دی، جنگ کے سامان کا تعیّن، تلوار اور گھوڑے وغیرہ کے شاعرانہ اوصاف کا بیان بھی میر ضمیرؔ ہی کی فکرِ بلیغ کا نتیجہ ہے، میر خلیقؔ نے میر ضمیرؔ کے ساتھ مرثیہ گوئی کے فن کو ترقی دی بلکہ اپنی افتادِ طبع سے میر خلیقؔ کے مرثیوں میں سوز و گداز زیادہ ہے اور یہی فرق ان کے شاگردوں یعنی میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ میں ہے۔

انیسؔ اور دبیرؔ نے مرثیہ کو بامِ عروج پر پہنچا دیا اور کوئی مضمون ایسا نہیں ہے۔ جس کو انہوں نے درجۂ کمال پر پہنچا کر نظم نہ کیا ہو، اخلاقی مضامین نظم کیے تو اس طرح کہ مرثیہ کو اخلاقی شاعری کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا چنانچہ اعلانِ حق، پاسِ صداقت، ایفائے عہد، خودداری، صبر و رضا، ہمّت و استقلال، ایثار، دشمن سے حُسنِ سلوک، عفو درگزر، صلح پسندی، چھوٹوں پر شفقت، بزرگوں کا ادب، انسانی ہمدردی وغیرہ یہ تمام محاسن ان حضرات کے کلام میں نہایت وضاحت سے پائے جاتے ہیں۔ نیچرل شاعری کا سراغ ان مرثیوں میں لگائیے تو نہایت اعلیٰ پیمانے کی شاعری ملے گی۔ مناظرِ فطرت کی عکاسی میں ان مرثیوں میں ایسے نمونے ملیں گے کہ عقل دنگ رہ جائے پھر لطف یہ کہ مرثیہ کے مزاج کو مجروح نہیں ہونے دیا، ان حضرات کے بعد مونسؔ، اُنسؔ، سلیسؔ اور وحیدؔ تک مرثیہ کے اجزائے ترکیبی وہی رہے جو اِن بزرگوں نے قائم کیے تھے، پیارے صاحب رشیدؔ نے مرثیہ میں بہار اور ساقی نامہ کو داخل کیا اور اس طرح مرثیہ کو ایک نئے مضمون سے آشنا کیا، مگر اس طرح مرثیہ میں سوز و گداز کا عنصر کم ہو گیا اور مرثیہ داد و تحسین کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا۔

پیارے صاحب رشید کے بعد جو لوگ مرثیہ گوئی میں نمایاں ہوئے ان میں افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی، نسیم امروہوی، نجم آفندی، سید آل رضا اور جوش ملیح آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے مرثیے کے اجزا تو وہی رکھے لیکن روحِ کربلا اور شہادت عظمیٰ کو ایک تحریک کی صورت دی اور یہ طریقہ کامیاب بھی رہا کیونکہ اگلے مرثیہ گوؤں نے ہر مضمون ایسے اسلوب اور ندرتوں کے ساتھ نظم کیا ہے کہ اس پر ترقی یا اضافہ کی سرِ مو گنجائش نہیں چھوڑی اور اگر یہ صورت اختیار نہ کی جاتی تو اندیشہ تھا کہ مرثیہ کی صنعت ہی ختم ہو جاتی، مرثیہ کو اسی صورت میں زندہ رکھا جا سکتا تھا کہ اس کو شہادت کے اعلیٰ مقاصد کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا جائے اور دورِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ اُسے مربوط اور منظم کر دیا جائے اور اس طرح اس کی ایک نئی جہت مقرر کی جائے۔

ان بزرگوں کے بعد جو نام سامنے آتے ہیں اُن میں صبا اکبر آبادی، ڈاکٹر یاور عباس، سردار نقوی، اُمید فاضلی، ڈاکٹر ہلال نقوی اور اثر جلیلی قابلِ ذکر ہیں۔

اثر جلیلی فارسی اور اُردو شعر و ادب پر بڑی اچھی نگاہ رکھتے تھے، انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز روایتی غزل گوئی سے کیا اور اپنے ایک عزیز معین الدین اجمیری سے کسبِ فیض کیا۔ میری ان کی ملاقات اجمیر کے ایک مشاعرہ میں ہوئی اور پھر یہ ملاقات ان کے دلی کے قیام کے زمانے میں گہری دوستی میں بدل گئی، انہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ عرصہ دلی میں گذارا اور وہاں کی ادبی فضا سے بھی فیض حاصل کیا، تقسیم ملک کے بعد وہ کراچی آ گئے اور یہاں کی ادبی محفلوں کی رونق بنے، میں نے ان کی قادر الکلامی کے پیشِ نظر انہیں مشورہ دیا کہ وہ مرثیہ کہیں کیونکہ مرثیہ جذبات نگاری کے علاوہ بیانیہ اندازِ نگارش کا بھی مطالبہ کرتا ہے اور اس کے لئے شاعر کا قادر الکلام ہونا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ میری ترغیب پر انہوں نے مرثیے کہنے شروع کئے اور اس طرح اردو کی رزمیہ شاعری میں ایک اور خوشگوار اضافہ ہوا۔

اثر جلیلی رقیق القلب تھے اور سوز و گداز کی دولت سے مالا مال تھے انہیں یہ سوز، زندگی کے نامساعد تجربات اور حالات نے فراہم کیا تھا چنانچہ یہی سوز ان

کی شاعری کا سرمایہ ہے اور اس کی چھوٹ ان کی غزل پر بھی پڑتی ہے اور ان کی مرثیہ نگاری پر بھی۔

سانحۂ کربلا کے واقعات اور قدسی نفوس افراد سے کون واقف نہیں اور خاص کر مرثیہ نگار حضرات تو اس سانحہ کی تمام جزئیات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ اور یہی جزئیات نگاری مرثیہ میں تاثیر کا مواد فراہم کرتی ہے۔ اثر جلیلی نے بھی اسی جزئیات نگاری سے اپنے مرثیوں میں تاثیر اور تاثر کی ایسی فضا قائم کی ہے جو قاری اور سامع دونوں کو اپنی گرفت سے آخر تک آزاد نہیں ہونے دیتی اور یہی ان کے مرثیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

مرثیہ نگاری کی جو روایت انیسؔ اور دبیرؔ سے چلی تھی اس کی پابندی آج تک نہ صرف قائم ہے بلکہ ضروری بھی ہے، یعنی مرثیہ کی مخصوص بحریں، اس کے اجزائے ترکیبی یعنی چہرہ (تمہید) سراپا، رزم، بزم، گھوڑے تلوار اور مصائب کا بیان۔ ان اجزا کو انیسؔ اور دبیرؔ نے اپنے انداز میں برتا ہے اور ان کے شاگردوں یا ان کی پیروی کرنے والوں نے بھی انہی دونوں کے اسلوبِ نگارش کو ملحوظ رکھا ہے، اثر جلیلی دبیرؔ کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں وہی لفظی شکوہ، وہی دقیق مضامین، وہی منفرد اسلوب اظہار اور وہی تشبیہہ اور استعارے کا ابداع۔ اس سلسلے میں ان کا وہ مرثیہ جس کا چہرہ انہوں نے کوئٹہ کی برفیلی فضا سے سجایا ہے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور غالباً اس اعتبار سے منفرد بھی ہے کہ انہوں نے اس برفیلی فضا میں جذبوں کی حرارت کا جس طرح دروبست کیا ہے وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔ میں نے مثالوں سے دانستہ گریز کیا ہے تاکہ قاری خود میری نگارش سے متاثر ہوئے بغیر کوئی رائے قائم کر سکیں اور مرثیہ نگاری میں اثر جلیلی کا وہ مقام متعین کر سکیں جس کے وہ حقدار ہیں

مشاعروں کی کہانی

مشاعروں کی روایت غالباً اتنی ہی پرانی ہے۔ جتنی خود اردو شاعری!

ان مشاعروں سے ہمارے بہت سے تہذیبی اور ادبی رشتے قائم ہیں، اور انہی مشاعروں میں شاعری نے تہذیب سے اور تہذیب نے شاعری سے بہت سے سبق لیتے ہیں!!

مشاعرے میں بادشاہ کے پاؤں پھیلاتے اور پھر پاؤں میں تکلیف ہونے کے عذر پر تہذیب و شائستگی کا یہ سبق بھی کہ "حضور اگر پاؤں میں تکلیف تھی تو زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" مشاعرے ہی میں دیا گیا۔ میر و مرزا کی دلی میں "اور بستی نہیں یہ دلی ہے" کا نعرہ بھی میر نے غالباً کسی مشاعرے ہی میں لگایا ہوگا۔ اہل لکھنؤ کو پورب کے ساکنو!! کا طعنہ بھی مشاعرہ ہی میں دیا گیا۔ اور مصحفی کی یہ تعلّی بھی "ان گھامڑوں کو میں نے سخنور بنا دیا" لکھنؤ کے کسی مشاعرے ہی کا شاخسانہ ہوگی۔ غرض یقین و میر تقی میر، سودا اور ضاحک اور انشا و مصحفی کے ادبی ہنگامے، غالب اور ذوق کی سنجیدہ چشمکیں، داغ اور امیر مینائی کی معرکہ آرائیاں، آغا شاعر اور بیخود وسائل کی نوک جھونک سب مشاعروں ہی کا نتیجہ ہیں۔

انہی مشاعروں میں نہ جانے کتنے ہدہد، کتنے بوم اور کتنے عندلیب اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ گئے، کتنے اختر، کتنے قمر اور کتنے مہر، طلوع و غروب کے تواتر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو گئے، اور نہ جانے کتنے دل اور کتنے جگر غم روزگار کا ہدف بنے اور کتنے فانی، باقی، اور کتنے باقی فانی ہو گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا!!

میرے بچپن میں گلستان بوستان، انوار سہیلی، خالق باری اور مثنوی ملا غنیمت کلام مجید کے ساتھ ساتھ عام طور پر بچوں کو پڑھائی جاتی تھی اور اس طرح ہر شخص

کو کم از کم خطوں ہی میں لکھنے کے لئے موقع کے دس بیس شعر ضرور یاد ہوتے تھے اور اس طرح شعر فہمی کا مذاق عام تھا۔ اُس زمانے کی دِلّی میں، بیخود دہلوی، سائل دہلوی، آغا شاعر قزلباش، پنڈت امرناتھ ساحر، زار زتشی اور شیدا دہلوی اور نوجوانوں میں مہاراج بہادر برق اور جادو دہلوی بزم ادب کی رونق تھے۔ یہ شعر برق ہی کا ہے جو میر سے منسوب ہے

وہ آئے بزم میں اتنا تو برق نے دیکھا

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

دِلّی کے بزرگ شعرا میں آغا شاعر قزلباش بڑے طباع اور دلچسپ شخصیت کے مالک تھے، جوانی میں غیر معمولی خوبصورت رہے ہوں گے، بڑھاپے میں بھی سُرخ و سفید تھے۔ وضع قطع سے وہ بالکل دلّی والے نہیں معلوم ہوتے تھے، سر پر پشاوری کلاہ دار پگڑی، اُٹنگی چھوٹی مُہری کی شلوار، بند گلے کی قمیض اس پر لمبا کوٹ پاؤں میں انگریزی جوتا اور ہاتھ میں موٹا ڈنڈا۔ آغا صاحب مشاعروں میں کم شریک ہوتے۔ مشاعرے میں جب غزل پڑھنے کی باری آتی تو نہایت منمنی آواز میں "ہائے آغا شاعر مر گیا"، "ارے مُردے کو کیوں گھسیٹ لائے" کا نعرہ لگاتے اور ہائے ہائے کرتے شعر پڑھنے بیٹھتے، غزل شروع کرنے سے پہلے فرماتے۔

صاحبو! میرا قاعدہ ہے کہ میں تبرکاً استاد کے دو شعر پہلے پڑھا کرتا ہوں اور یہ کہہ کر داغ کے منتخب شعر نہایت پاٹ دار آواز میں پڑھتے، سننے والے حیران ہوتے کہ یکایک آواز میں یہ دم خم کہاں سے آگیا۔ آغا صاحب نہایت عمدہ تحت اللفظ پڑھتے اور الفاظ اور لہجے کی تصویر بن جاتے۔ اُس زمانے میں شائد ہی اُن جیسا تحت اللفظ پڑھنے والا اور کوئی ہو، بڑے بڑے مترنم شاعر اُن کے آگے ماند پڑ جاتے اور اس طرح وہ داغ کے شعروں سے مشاعرہ اُلٹ پلٹ کر دیتے اور داد کے اسی تاثر میں وہ اپنی غزل پر دوسروں سے زیادہ داد حاصل کر لیتے۔ آغا صاحب داغ کے اچھے شاگردوں میں شمار ہوتے تھے وہ بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

ہلالِ ابروئے خمدار کی تصویر پیدا ہے

ذرا تم سامنے آنا کہ ہم نے چاند دیکھا ہے

شیخ کو جو پارس کہتا ہے اس کو کیا کہوں!
میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے وہ میخانے میں تھا

شاعرِ نازک طبیعت ہوں مرا دل کٹ گیا
ساقیا اینا کہ شائد بال پیمانے میں تھا

اس واسطے تھم تھم کے ہے جاری نفس اپنا
آہوں سے کہیں ٹوٹ نہ جائے قفس اپنا

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی!

جو برق و باد پہ قادر وہ اس قدر مجبور
کہ ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں

یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آغا حشر، آغا شاعر قزلباش ہی کے شاگرد تھے اور آغا حشر اپنے نام کے ساتھ آغا کا سابقہ اسی نسبت سے لگاتے تھے۔

سائل دہلوی داغ کے داماد تھے، وہ داغ کی منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم کے، جو داغ کی سالی اولیا بیگم کی نواسی تھی شوہر تھے، لاڈلی بیگم اس سے پہلے سائل صاحب کے چھوٹے بھائی ممتاز الدین احمد خان مائل کی منکوحہ تھیں ان کے انتقال کے بعد سائل دہلوی سے ان کی شادی ہو گئی۔ سائل صاحب کا تعلق لوہارو والوں سے تھا۔ وہ نہایت باوضع اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے اور پرانی تہذیب و شائستگی کا نہایت عمدہ نمونہ!! خود نہایت خوبصورت خط و خال کے مالک تھے، شعر ترنم سے پڑھتے تھے اور خوب پڑھتے تھے۔

یہ مسجد ہے یہ میخانہ تعجب اس پہ آتا ہے
جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی اور یوں بھی!

بیخود دہلوی داغ کے طباع شاگردوں میں شمار ہوتے تھے، بھاری جثہ، سانولے رنگ اور چوڑے چکلے جسم کے آدمی تھے۔ ہزار دانے کی تسبیح ہاتھ میں رہتی، ترکی ٹوپی اور شیروانی ان کا عام پہناوا تھا۔ انگریزوں کو اردو پڑھاتے تھے۔

شعر گوئی پر بڑا ناز تھا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، شہر میں بے شمار ان کے شاگرد تھے۔ شعر گرجدار آواز میں پڑھتے اور مشاعروں میں اکثر ہنگامہ آرائی کا باعث بنتے۔

پنڈت امرناتھ ساحر دلی کے کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ اسلامی ہندی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھے لمبا قد، چھریرا جسم، سفید نہایت لمبی ڈاڑھی گندمی رنگ کھلتا ناک نقشہ، شعر نہایت کریہہ آواز میں پڑھتے تھے۔، پنڈت جی کے گھر پر ماہانہ مشاعرہ ہوتا تھا اور شہر کے معزز شعرا اس میں شریک ہوتے تھے۔ پنڈت جی کا ایک شعر سنیے، غالب کی زمین میں اچھا شعر نکالا ہے۔

کوئی حرم سے دَیر سے منسوب ہے کوئی
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے

چندر دہلوی انہی کے شاگرد تھے بعد میں باغی ہو گئے تھے۔

شیدا دہلوی، دلی کے کالستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، دبلا پتلا جسم، سانولا رنگ، چست پاجامہ اور شیروانی ان کا عام لباس تھا شعر پھسپھسا کہتے تھے ترکماں دروازے میں رہتے تھے۔

زار زتشی بھی داغ کے شاگرد تھے، دلی والا ہونے اور اپنی زبان و ثقافت پر ان کو بہت ناز تھا، شعر نہایت خشک کہتے تھے، مگر اجڑی ہوئی دلی میں تہذیب کی شمع روشن کر رکھی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے گھرانے میں نہایت پاکیزہ زبان بولی جاتی تھی۔ اُن کا منجھلا لڑکا رتن موہن زتشی میرا ہم سبق

تھا اور اب مشہور شاعر ہے تخلص غار ہے۔

اس تمہید کا مقصد اصل میں دلی کے مشاعروں کا پس منظر پیش کرنا ہے۔ یوں تو ان شعرا کو اکثر سننے کا موقع ملا لیکن بزم غالب کے مشاعرے میں جسے خواجہ حسن نظامی نے ترتیب دیا تھا ان سب بزرگوں کو ایک جگہ دیکھا اور سنا یہ مشاعرہ نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوا تھا اور دو دن جاری رہا مسز سروجنی نائڈو، سر گرجا شنکر باجپائی، سر محمد یعقوب، سر رضا علی، سر عبدالرحیم اور مولانا شوکت علی کے علاوہ ہندوستان کے تمام معروف شعرا اس میں شریک تھے۔ مصرع طرح تھا ع

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

یہ مشاعرہ ۱۹۳۳ء میں عربک کالج میں ہوا تھا۔

میں ۱۹۲۵ء میں اپنے نانا مولوی عنایت اللہ صاحب (مرحوم) ناظم دارالترجمہ کے پاس حیدرآباد چلا گیا اور حیدرآباد کے مشہور اسکول دارالعلوم میں داخل ہوگیا، یہ اسکول ہندوستان کے قدیم ترین اسکولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں مہاراجہ سرکشن پرشاد نے بھی تعلیم پائی تھی۔ شعر کا شوق مجھے بچپن ہی سا تھا اور یہی شوق مجھے سامع کی حیثیت سے مختلف مشاعروں میں لے گیا، اس زمانے میں حیدرآباد میں مشاعروں کا خاصا زور تھا ایک مشاعرہ ضامن کنتوری کے گھر پر اور ایک باقی بدایونی کے گھر پر یعنی اختر حیدرآبادی کے والد اور نظر حیدرآبادی کے دادا کے گھر ہر مہینے ہوتا اور ان مشاعروں میں شہر کے معزز شعرا شریک ہوتے۔ پھر مہاراجہ سرکشن پرشاد کے یہاں بھی ماہانہ مشاعرہ ہوتا اور اس میں عزیز یار جنگ، ضیا یار جنگ، اختر یار جنگ، شہید یار جنگ، بیگم لکھنوی، غبار لکھنوی، مسعود علی محوی، لبیب تیموری، عبداللہ عمادی، ثاقب بدایونی، اور برتر لکھنوی وغیرہ شریک ہوتے، بعد میں جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، حیرت بدایونی اور ماہر القادری بھی شریک ہونے لگے، میں ۱۹۳۸ء کے بعد شریک ہوا۔

۱۹۳۱ء میں ایک مشاعرہ جامعہ عثمانیہ کے ہوسٹل مسرت منزل میں نظم طباطبائی

کی صدارت میں ہوا، اس میں مرزا ہادی رسوا بھی شریک تھے، نظم طبا طبائی چوڑی ہڈی کے آدمی تھے، میں نے انہیں جب دیکھا تو وہ اسّی ۸۰ برس کے ہوں گے۔ وہ واجد علی شاہ کے دربار کے آدمی تھے اور انہوں نے شہزادوں کو عربی پڑھائی تھی۔ مشاعرہ میں زیادہ تر جامعہ کے طلبائ نے کلام سنایا اُن میں زیبا ردولوی، عبد القیوم باقی اور بدر الدین بدر مجھے یاد ہیں۔ آخر میں طبا طبائی نے اپنا کلام سنایا اور پھر میر انیس کی غزل کے کچھ شعر سنائے، ایک شعر یاد رہ گیا ہے آپ بھی سنیئے ؎

خار کو گل کے قریں دیکھ کے یہ سمجھا!
چیختے چیختے بلبل کی زبان سوکھ گئی!

طبا طبائی بہت زیادہ گراں گوش تھے۔

۱۹۳۲ء میں فانی بدایونی حیدر آباد دکن آئے ان کی آمد پر عدن منزل میں ایک مشاعرہ مہاراجہ کی صدارت میں ہوا اور اسی میں میں نے پہلی مرتبہ فانی کو دیکھا اور سنا، ان کا ترنم نہایت دلگداز تھا جو غزلیں انہوں نے پڑھیں ان میں سے ایک غزل کے دو۲ شعر سنیئے ؎

گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر!
تجلّیات کے دریا بہا دیئے تُو نے!
سُرودِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تُو نے

جامعہ عثمانیہ کے یوم تاسیس کے سلسلے میں ایک کل ہند مشاعرہ ہوا، سیماب اکبر آبادی اور حفیظ جالندھری پہلی مرتبہ حیدر آباد آئے، میں اور فانی صاحب ایک ساتھ مشاعرے میں گئے، اتفاق سے حفیظ جالندھری کو ہمارے قریب ہی جگہ ملی، جب مشاعرہ ختم ہوا تو حفیظ جالندھری فانی سے دیر تک باتیں کرتے رہے غالباً حفیظ نے بھی پہلی مرتبہ فانی کو دیکھا اور سُنا تھا۔ حفیظ نے فانی سے کہا کہ دیکھئے میں نے بچّوں کے نصاب کے لئے یہ نظم لکھی ہے اور مجھے اس کے

استنے روپئے ملے ہیں مجھے اس نظم کی صرف ٹیپ یاد رہ گئی ہے۔ "چل رے چرخ چرخ چوں" آپ بھی ایسی ہی شاعری کیجئے آپ کی کسی نے بہت قدر کی تو یہی کرے گا کہ آپ کا دیوان خرید کر لائبریری میں رکھ لے گا۔ فانی نے نہایت متانت سے کہا کہ جی ہاں میری شاعری کا مجموعہ لائبریری میں ہوگا اور آپ کا کلام بچے پڑھیں گے۔

جگر مراد آبادی ۱۹۳۵ء میں پہلی مرتبہ حیدر آباد گئے، دعوتوں اور مشاعروں کی کوئی حد اور شمار ہی نہ رہا، ہر طرف دعوت ہر جگہ مشاعرہ، ایک مشاعرہ میں نے بھی راجہ پرتاب گیر کی کوٹھی میں، مولوی عبدالحق کی صدارت میں مرتب کیا، اس میں مہاراجہ بہادر بھی شریک ہوئے، مشاعرہ کی خصوصیت یہ تھی کہ شعرا کی تعداد صرف چار تھی، فانی بدایونی جگر مراد آبادی، سکندر علی وجد جو غالباً سیکنڈ ایئر میں تھے۔ فانی صاحب کے ایک ہندو مہمان شام اکبر آبادی۔

مشاعرہ کی عمدگی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ فانی نے (جو شعر سنانے کے زیادہ عادی اور شوقین نہیں تھے) دس بارہ غزلیں سنائیں اور آخر میں کہنے لگے کہ میں نے زندگی بھر ایسا مشاعرہ نہیں دیکھا۔

ایک اور مشاعرہ جگر کے اعزاز میں انجمن اساتذہ کی جانب سے ولیک وردھی تھیٹر میں ہوا۔ مہاراجہ بہادر صدر تھے، جگر نے نہایت مستانہ انداز میں غزل پڑھی ؎

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے!

اس کے بعد فانی کی باری آئی، سامعین سکتے میں تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ مشاعرہ تو جگر نے لوٹ لیا کہیں فانی کو شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ فانی نے نہایت درد انگیز لہجے میں یہ مطلع پڑھا ؎

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی!
منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

مطلع کا پڑھنا تھا کہ ہر طرف سے داد و تحسین کا وہ شور اٹھا کہ بس، مطلع بار بار

پڑھوایا گیا، مہاراجہ بہادر نے بھی بہت داد دی، اس مشاعرہ کا منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

فانی کی شرارتیں بھی ان کی شاعری کی طرح پیچ در پیچ ہوتی تھیں، ایک دفعہ بہادر یار جنگ کی ڈیوڑھی میں مشاعرہ تھا۔ فانی، آزاد انصاری، حیرت بدایونی، ماہر القادری، حرماں خیر آبادی اور بعض دوسرے شعرا بھی شریک مشاعرہ تھے اس مشاعرے کا بندوبست عرشؔ تیموری مرحوم نے کیا تھا۔

حرماں خیر آبادی تازہ تازہ حیدر آباد آئے تھے اور ماہر القادری ہی کے یہاں مقیم تھے اور ان کے اخراجات کی ساری کفالت بھی ماہر ہی کے ذمے تھی۔ ماہر جب غزل پڑھنے بیٹھے اور جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

سرد ہو گیا شاید سوزِ قلبِ پروانہ!
آج شام ہی سے کیوں شمع جھلملاتی ہے

تو فانی نے ایک خاص انداز سے ہم لوگوں کو دیکھا، اُن کے اس طرح دیکھنے کو کچھ وہی لوگ خوب سمجھ سکتے تھے جو اُن سے زیادہ قریب اور بے تکلف تھے، اور کہا کہ بھئی "شمع جھلملاتی ہے کی جگہ "شمع ٹمٹماتی ہے" ہونا چاہیئے۔ حرماں خیر آبادی نوراً بات کو لے اُڑے اور سرِ مشاعرہ ماہر کو بہ آوازِ بلند ٹوکا کہ "شمع ٹمٹماتی ہے" پڑھیئے۔ اُدھر بیچارے ماہر پریشان کہ یہ ہوا کیا، اِدھر ایک قہقہہ بلند ہوا اور فانی مسکرا کر رہ گئے۔ حرماں خیر آبادی کو فانی استاد کہا کرتے تھے۔

میں تقریباً ہر سال دلّی آتا اور دورانِ قیام میں دلّی اور دلّی کے قرب و نواح کے مشاعروں میں بھی کبھی کبھی شریک ہوتا، میرٹھ میں "اسلم کی بلّی" والے اسلم جو اسمٰعیل میرٹھی کے فرزندِ ارجمند تھے ہر سال اپنے والد کی یاد میں ایک کل ہند مشاعرہ کراتے تھے۔ اس مشاعرہ میں ہندوستان کے تمام معروف شاعر شریک ہوتے اور مشاعرہ نہایت عمدہ مشاعرہ ہوتا۔ رات کے بارہ بجے ہوں گے مشاعرہ اپنے شباب پر تھا ایک صاحب نے غزل سے پہلے ایک قطعہ پڑھا جس کا چوتھا مصرع تھا۔ ع

نگاہِ اہلِ بصیرت میں توتیا ہوں میں

کسی دل جلے نے فقرہ کسا کہ حضور تتلا کے نہ پڑھیئے، بس پھر کیا تھا۔ مشاعرہ زعفران زار بن گیا اور پھر دیر تک کوئی شاعر نہ جم سکا۔

دلی کی ہارڈنگ لائبریری میں کل ہند مشاعرہ ہو رہا تھا، نوح ناروی، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، احسن مارہروی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، مجاز، جذبی، غرض سبھی اچھے شعرا موجود تھے، ساغر نظامی نے تحت اللفظ پڑھنے والوں پر کوئی فقرہ کسا، اتفاق سے اس کے بعد مولانا احسن مارہروی کی باری تھی۔ مولانا نے برجستہ یہ رباعی پڑھی ؎

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں
بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں معاف نوجوانانِ سخن!!
بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

مشاعرہ میں داد و تحسین کا وہ شور بلند ہوا کہ بس اور ساغر نظامی کو خاصی خفت اُٹھانی پڑی۔

مشاعرے جب تک شاعری ہے قائم رہیں گے لیکن اب مشاعروں اور دنگلوں میں زیادہ فرق نہیں۔ نہ وہ لوگ ہیں جن کے دم سے شاعری کا بھرم تھا، اور نہ وہ لوگ جن سے تہذیب زندہ تھی، ہمارے کتنے ساتھی ہم سے جدا ہو گئے، ادیب سہارنپوری، ارم لکھنوی، ظریف جبلپوری، حفیظ ہوشیارپوری، سید محمد جعفری، ماہر القادری، سراج الدین ظفر اور قمر جلالوی!! ۔ مشاعروں کی کہانی بڑی طویل ہے اور طویل رہے گی۔ میں پہلی بات دُہرا دوں، مشاعروں نے ہماری تہذیب اور ادب کو پروان چڑھایا ہے اور مشاعروں ہی میں تہذیب نے شاعری سے، اور شاعری نے تہذیب سے بہت سے سبق لئے ہیں، کاش آئندہ بھی ایسا ہو!!!

اردو شاعری میں ساقی کا کردار

ہر ملک کا ادب اپنے کچھ علاماتی اور اشاراتی تصورات رکھتا ہے۔ چونکہ ان استعارات کے ذریعہ نازک سے نازک خیال کی ادائیگی میں آسانی ہوتی ہے اس لئے یہ استعارات آہستہ آہستہ ادب کا مزاج بن کر رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ ان تصورات کو بالکل کرداروں کی سی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے گو زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کی اہمیت بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ قدیم یونانی آرٹسٹ اور ادیب اپنے آرٹ میں علم و حکمت اور حسن و خوبصورتی کے دیوتا اپولو کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے تصور سے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہیں اور بالعموم اسی کے نام سے آغاز کلام کیا جاتا تھا۔ اہل عرب کے ادب میں خیالات کے اظہار کے لئے اونٹ، تلوار، گھوڑا، کھجور اور نخلستان اہم ترین استعارات اور تشبیہات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہندی شاعری کے کردار مور، پپیہا، کوئل اور سکھی وغیرہ ہیں۔

جغرافیائی اور سیاسی حالات ہر ملک کے ادب پر ہمیشہ سے اثر انداز ہوتے آئے ہیں، ایران میں فتح و نصرت کے شادیانے بج رہے ہیں۔ ہر طرف ایرانی فوجیں اپنے جھنڈے گاڑ رہی ہیں سپاہی میدان جنگ میں داد شجاعت دے دے کر رقص و سرود کی محفلیں اور نائے و نوش کی مجلسیں آراستہ کرتے ہیں اسی وجہ سے رستم و سہراب کے پہلو بہ پہلو ان کے ادب میں مطرب، مغبچے اور ساقی بھی نظر آتے ہیں ایران کے سیاسی حالات رفتہ رفتہ بگڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ رستم و سہراب قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں البتہ شباب و شعر کی زندگی میں مطرب و ساقی زندہ رہ جاتے ہیں۔

اہل فارس کے حملوں کے ساتھ ہندوستان پر اُن کے ادب نے بھی یلغار

کی۔ ابتدائیں فارسی اور عربی کے انمل بے جوڑ الفاظ کے پیوند ہندی میں لگائے گئے رفتہ رفتہ اردو غزل نے ایک نیا روپ دھارا۔ تصورات، تخیلات اور طرزِ ادا کے ساتھ ساتھ مفروضاتِ شاعری بھی وہی رہے۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ، شیخ و ناصح، مطرب و ساقی وغیرہ وغیرہ۔ گو امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ادبی رجحانات بھی نئے سے نئے انقلابات کا شکار بنتے رہے۔ پرانی روایتوں کے آثار پر نت نئی اختراعات بنتی چلی گئیں۔ ہر نقشِ ثانی بہتر سے بہتر ہوتا چلا گیا۔ لیکن آج بھی اردو غزل کا لطف ان کرداروں کے بغیر کچھ بے نمک سا معلوم ہوتا ہے۔

ایرانی نژاد ساقی نگارستان ہند میں جلوہ گر ہوا اساتذۂ سخن نے ہاتھوں چھاؤں پروان چڑھایا۔ دیکھتے دیکھتے چار دانگِ ہند پر چھا گیا۔ محبت کی محفلوں اور حسن کی مجلسوں میں اس کا جلوہ عام ہوا، اور ہر طرف اسی کے نام کا سکہ رواں ہونے لگا۔ عشاق کے جمگھٹے، حسینوں کے پرے، اغیار کی صحبتیں، شیخ و صوفی کی خلوتیں بھی اسی کے ذکر سے گونجنے لگیں۔ لوگوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اسے اپنے دلوں میں جگہ دی۔ کسی نے عشاق کا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھا، کوئی اس کو بھی "بزمِ گلرخاں" کا انمول رتن سمجھنے لگا۔ کسی نے اسے رقیبوں کا محرمِ راز اور جاسوس جانا، خود ساقی میں اس قسم کی تمام صلاحیتیں تھیں۔ غرض ساقی کی ذات جامع الکمالات مانی گئی۔ شیخ و زاہد سے بھی دوستی رہنے لگی۔ حد یہ کہ محتسب کو ایسا گرویدہ کیا کہ وہ بھی اس کے حلقہ بگوشوں میں شمار ہونے لگا۔ مگر اس بہروپ میں ساقی نے بھی شاہد پرستی اور جنونِ عشق کے مزے لئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی البتہ اکادکا پیرِ جہاندیدہ نے ذرا شبہ کی نظر سے دیکھا ؂

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

یا کوئی زخم خوردہ بدظن یہ کہہ کر چپ ہو گیا ؂

کسی کے آتے ہی ساقی کے ایسے ہوش اڑے
شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشہ میں

ان بہروپوں کے علاوہ ساقی نے اور بھی بھیس بدلے۔ کہیں "مے فروش" بنا اور کہیں "پیر مغاں"۔ "مے فروش" کا نام سنتے ہی ذہن میں نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ چاروں طرف نظر ڈالیے تو عجیب عالم دکھائی دے گا، مستی و ہشیاری کا بازار، کیف و سرور کی دنیا، ہائے و ہو کے نعرے، مغبچوں کی چیخ پکار، میفروش کی ڈانٹ ڈپٹ، ایک طرف جھوٹ میں کچھ ثقہ صورتیں اپنی باری کا انتظار کر رہی ہیں۔ کیا کریں عادت سے مجبور ہیں۔ کسی کونے میں کچھ بلانوش خشتِ خم پر کعبہ کی بنیاد رکھنے میں مشغول ہیں، کچھ منچلے ساغر ٹپک ٹپک کر چشمۂ زمزم نکالنے کی جستجو میں ہیں۔ کچھ خراباتی من و تو کی اُلجھنوں میں گرفتار، ان میں کچھ کافر، پوشیدہ ولی بھی ہیں۔ غرض عجب کیفیت ہے ہوا میں شراب کی تاثیر ہے زمین سے شراب کے چشمے اُبل رہے ہیں اور یہ ساری گہما گہمی ساقی کے ایک روپ "میفروش" کے دم سے ہے۔

اب کسی نئے زمانے کے "پیر مغاں" کا تصور کیجیے۔ پرانے "پیر مغان" میں اور ان میں بس وہی فرق ہے جو کسی بھٹیاری کی دکان اور ہوٹل میں ہے یہ اپنا کام ذرا اعلیٰ پیمانہ پر شروع کرتے ہیں۔ کسی عالیشان عمارت میں سینکڑوں میزیں قرینے سے بچھی ہیں اردگرد خوبصورت کرسیاں دھری ہیں۔ "پیر مغاں" کسی امتیازی جگہ پر ایک تجوری کے پاس براجمان ہیں۔ نئی وضع کے مغبچے اہلے گہلے پھر رہے ہیں شراب اور گزک کے خوان پر خوان ادھر سے اُدھر آ جا رہے ہیں، ساتھ ساتھ موسیقی کی نرم نرم تانیں گوش نوازی کر رہی ہیں۔ شوقین طبع، زمانے سے طرح دار نازک بیاں و نازک خیال جمع ہیں۔ کبھی شامت کے مارے حضرت ناصح اور جناب شیخ بھی آ نکلتے ہیں۔ مگر چوری چھپے ؂

دیکھنا پیر مغاں حضرتِ ناصح تو نہیں
کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خُم مجھ کو!

یہ مسجد ہے یہ میخانہ تعجب اس پہ آتا ہے
جناب شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غرض یہ تمام رونق ساقی کے دوسرے روپ "پیر مغاں" کے دم سے ہے۔

اب ساقی کا اصلی روپ ملاحظہ فرمائیے، احباب کا مجمع ہے۔ اربابِ نشاط حاضر ہیں، رقص و سرود کی محفل شباب پر ہے۔ دلوں میں محبت کی آگ دبی ہے تمنائیں مچل رہی ہیں، ایک پرکالۂ آتش خم گردن کے سہارے مینا اٹھائے چلا آتا ہے، جام کا دور پر دور ہو رہا ہے۔ سرمستی اور سرشاری کی ہر طرف دھوم ہے میکشوں کا بس نہیں چلتا کہ ساقی پر جان نچھاور کردیں مطرب پر دین و ایمان تصدق کر دیں ؎

ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی

مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

کوئی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر کہہ رہا ہے ع

یہاں بادہ ہے وحی و جام پیغمبر، خدا ساقی

غرض ساقی کے شیدائیوں کا ہنگامہ سا برپا ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی دھن میں مگن کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ ماہی سے ماہ تک کے قلابے ملائے جا رہے ہیں کہ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ مگر نہیں بعض آوازیں کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے اور پہچانیے۔ کوئی دل جلا الم نصیب عالم کی بے ثباتی سے نالاں ہے اور چاہتا ہے کہ جب تک یہ واہمہ باقی ہے ساقی کی نگاہیں نہ پھریں ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

کوئی مرتد بہک اُٹھتا ہے ؎

کہاں کا میخانہ کس کا ساقی کچھ اور بڑھنے دو بیخودی کو

یہی بنائے گی جام و ساغر یہی کرے گی شراب پیدا

اور کوئی خوددار پکار اُٹھتا ہے ؎

حجابِ جلوۂ ساقی ہے میری بیہوشی

کچھ اور چاہیئے مستی کہ بیخودی نہ رہے

کوئی قدح خوار اپنے ظرف کے بارے میں انکسار سے پیش آتا ہے ؎

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ

ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہہِ جام بہت ہے

ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو ہر ذلّت کے باوجود چاہتے ہیں ؂

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے

پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل

جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ پارسائی کا

کوئی اپنی بیتابی میں احترامِ ساقی کا بھی خیال نہیں رکھتا ؂

ساقی ہے یک تبسّمِ گُل فرصتِ بہار

ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

چند پہنچے ہوئے میخواروں کا تقاضا ہے ؂

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو

کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

مجھے میسّر نہیں وہ مستی جو ہے سوائے شراب ساقی

بڑا کرم ہو اگر اُٹھا دے یہ جام دے کے حجاب ساقی

کوئی صرف ساقی کی ادائیں دیکھ رہا ہے ؂

سرمستیٔ حیات ہے ہر لغزشِ قدم!

ساقی کی دلفریبیٔ رفتار دیکھنا

کسی نے خود اعتمادی پر بھروسہ کر رکھا ہے ؂

نفس موجِ محیطِ بےخودی ہے!

تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

کوئی شکوہ سنج ہے ؂

بزم میں پی سب نے مئے منہ سب کا ہم دیکھا کئے
چشمِ ساغر بن کے ہم ساقی کی محفل میں رہے

کسی نے ساقی کو اس کے کرم کا واسطہ دیا ہے کہ اس بہانے شائد کچھ اور مل جائے ؎

مرا جنونِ طلب ہے شائد ترے مذاقِ کرم کا باعث
فروغؔ یہ میری تشنگی ہے شراب ساقی شراب ساقی

بہر حال عجب عجب لوگ ہیں کوئی کہتا ہے ؎

نیتِ شب بخیر ایسے ساقی!
بزمِ جم کیا ہے ساغرِ جم کیا

احساسِ غیرِ بادہ گوارہ ہوا مجھے
لا جام ساقیا مئے مینا گداز کا

دیکھا آپ نے یہ تمام بزم آرائیاں ساقی کے دم سے ہیں کوئی ساقی سے کچھ کہہ رہا ہے اور کوئی کچھ، ساقی نامے پڑھے جا رہے ہیں۔ قصیدہ اور غزل کا تو ذکر ہی کیا۔ حسن و محبّت کی یہ تمام محفلیں آراستہ ہی تھیں کہ ایک قلندر آنکلا اور للکارا ؎

اِس دور میں مئے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

سب چونک پڑے، نشے ہرن ہو گئے، ساقی بھی ایک دفعہ تو جھجکا مگر قلندر نے صرف یہ کہا ؎

عشق و مستی نے کیا ضبطِ نفس مجھ پہ حرام

اس کے بعد دردناک آواز میں یہ اشعار گنگنانے لگا آپ بھی سنیئے اور اس درد کا مزا لیجئے ؎

دِگر گوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرّہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی

متاعِ دین و ایماں لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی
وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی
حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی
نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اور پھر ساقی کی طرف نہایت عجز و انکسار سے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

دیکھا آپ نے بزم حسن و عشق کے ساقی نے کتنے چولے بدلے۔ یہ ہیں زمانہ اور اس کی ضروریات کے تقاضے۔ اگر ادب زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کرے تو کس کام کا۔ ایسے ادیب کم ہیں جو اپنے اجتہاد سے ادب اور اس کے کرداروں کو بدل دیں ع

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ناکشیدہ

پودا ہی تناور درخت بنتا ہے لیکن اگر پودے ہی پھل پھول دینے لگیں تو اُسے قدرت کا کرشمہ اور معجزہ ہی کہا جائے گا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال خمار فاروقی کے ذہن کی ہے۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ ذہنی بلوغ کے مالک ہیں اور اسے بلاشبہ قدرت کا گرانمایہ عطیہ سمجھنا چاہیئے۔ اس وقت تک ان کی عمرِ شاعری پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں مگر احساسات اور وارداتِ قلبی کی ساری کیفیات سے ان کا دل مملو ہے۔ اور وہ انہی کیفیات سے اپنی شاعری کا تار پود بناتے ہیں۔

اس صنعتی دور میں زندگی جن مسائل سے دوچار ہے اُن میں سب سے زیادہ دلخراش مسئلہ انسان کا احساس تنہائی ہے اور یہی احساس تنہائی اسے زندگی کی اعلیٰ قدروں سے روز بروز بیگانہ کرتا چلا جارہا ہے، آدمی ہر لمحہ اس بھری پُری کائنات میں اپنے آپ کو تمام رشتوں سے کٹا ہوا محسوس کرنے لگا ہے، وہ محبت اور سکونِ قلب کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اور کسی گوشے سے اس کو اس کی محبت کا جواب نہیں ملتا۔ مذہب علماء کی موشگافیوں کی وجہ سے اسے تشکیک اور ریب میں مبتلا کر رہا ہے۔ سائنس اپنی خوفناک ایجادوں سے اسے روز بروز خوفزدہ کرتی جارہی ہے، اور وہ اپنے آپ کو ہر لحاظ سے غیر محفوظ محسوس کرنے لگا ہے۔

انسان کا اپنے اللہ سے رشتہ، انسان کا کائنات سے رشتہ اور انسان کا

انسان سے رشتہ، یہ ہیں انسان کے بنیادی مسائل!! فلسفہ کی موشگافیوں نے اللہ کے تصور ہی کو مبہم بنادیا ہے، اور اس ابہام میں آدمی اُلوہیت کی بے شمار نعمتوں سے کس طرح فیضیاب ہو سکتا ہے جب کہ اس کے قوائے باطنی منطق اور فلسفے کی ضرب کاری سے مفلوج ہو گئے ہوں۔ انسان کا کائنات سے رشتہ سائنس اور خاص طور پر جوہری ایجاد کی وجہ سے نہایت نا مستحکم ہو گیا ہے اور عناصر پر سے انسان کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے، وہ عناصر جن کی تسخیر اس کو ودیعت کی گئی اب اسے موت کی اتھاہ تاریکیوں کے غار میں دھکیلنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ وہ ان حالات میں اپنے دلی سکون کے لئے انسانی رشتوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے تو وہ بھی اسے کھوکھلے نظر آتے ہیں، ہر شخص ایک کرب ذات میں مبتلا ہے اور سوائے فریب خوردگی کے زندگی کا کوئی اور مقصد ہی نظر نہیں آتا ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے۔

خمار فاروقی بھی اسی معاشرے کے فرد ہیں اور وہ بھی انہی مسائل سے دوچار ہیں۔ ان کی شاعری انہی موضوعات کی تشریح کی صورت ہے۔

حوصلہ دیکھ زندگی میرا　　　اس زمانے میں جی رہا ہوں میں

اس شامِ بیکسی میں سُن اے بادِ نامراد　　　یہ کیا کیا چراغِ تمنا بجھا دیا

دل جلاتے رہے دل بجھاتے رہے　　　اس طرح بھی شبِ غم بسر ہو گئی

یوں تو گھرا ہوں مجمعِ احباب میں مگر　　　تنہا ہوں جتنا آج میں اتنا کبھی نہ تھا

اب اپنے سائے سے بھی بھاگتا ہوں　　　یہ دُنیا مجھ کو اتنا ڈس چکی ہے

بگولوں کی طرح میں اُڑ رہا ہوں　　　عجب وحشت، عجب دیوانگی ہے

یہ دُنیا مجھ پہ پتھر پھینکتی ہے درختوں کی طرح میں چُپ کھڑا ہوں

تنہائیوں کا کرب ہی کیا کم ہے اے خمار اک شمعِ آرزو ہے نہ اس کو بجھا ابھی

انسان نے سب سے پہلے اپنی ذات سے عشق کیا ہے اور اسی عشقِ ذات کا جہاں جہاں پر تو نظر آتا ہے انسان وہیں وہیں اپنی محبت کی قیام گاہیں تعمیر کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح یہ عشقِ ذات، عشقِ انسانیت اور عشقِ کائنات بن جاتا ہے اور پھر اس کا انفرادی لہجہ اجتماعی لہجہ بنکر سارے دکھ درد بیان کر دیتا ہے۔ شاعر اور عام آدمی میں یہی فرق ہے، عام آدمی کا غم اس کا ذاتی غم ہوتا ہے اور شاعر کا غم پوری انسانیت کا غم ہوتا ہے۔

ہر قدم زندگی کی رُسوائی چھین لو مجھ سے میری بینائی

ہمیں سے ہے فروغِ بزمِ ہستی نہ تھے جب ہم تو اس محفل میں تھا کیا

اب وہ دُنیا ہے نہ دُنیا کی وہ رعنائی ہے پھر بتا دے مرے کس کام کی بینائی ہے

جو کرب مجھ کو ملے ہیں اُنہیں چھپاؤں میں غموں میں ڈوب کے کچھ اور مسکراؤں میں

یہ حوصلہ ہے ابھی مجھ میں گردشِ دوراں کسی پہ سنگ اُٹھے اپنا سر جھکاؤں میں

ہر ایک شخص یہاں اپنی ذات میں گم ہے کوئی بتائے کسے حالِ دل سناؤں میں

قدم قدم پہ مجھے نفرتیں ملیں لیکن خمار پھر بھی محبت کے گیت گاؤں میں

دل یوں اُداس ہے تری بے مہریوں کے بعد
مُرجھا گیا ہو جیسے کوئی گل کھلا ہوا

نظریں ملائیں اہل نظر ہم سے اے خمارؔ
دیکھا ہے ہم نے پردۂ جاناں اٹھا ہوا

میں نے جس دن سے تجھ کو دیکھا ہے
آئینہ ہے مرا تماشائی

وہ تو خود سے بھی اب نہیں واقف
جس کی دُنیا سے ہے شناسائی

تخیل میں سجا کر بزمِ اُمید
دلاسے دے رہا ہوں دل کو کیا کیا

ہمیں سے ہے فروغِ بزمِ ہستی
نہ تھے جب ہم تو اس محفل میں تھا کیا

چُرا کر اُس نے نگاہیں مجھے جو دیکھا ہے
یہ اعترافِ محبت نہیں تو پھر کیا ہے

کہاں تک آ گئی ہے اس دل کی موجِ بیتابی
سرِ اشکِ غم مری پلکوں پہ آ کے مچلا ہے

ہاں بات جب ہے اے نگہِ گرمِ التفات
اک شعلہ سا بدن میں لپکتا دکھائی دے

دل دھڑکنے کی صدا بھی نہیں آتی اب تو
عالمِ شوق میں تنہائی سی تنہائی ہے

ترے فراق میں کٹتی ہیں اس طرح راتیں
کبھی چراغ جلاؤں کبھی بجھاؤں میں

شاید فراق نام حیاتِ ابد کا ہے
جو جی سکے نہ ہجر میں وہ لوگ مر گئے

اپنا سب کچھ پھونک کے میں نے خود جال بنایا ہے	بر بادی کا میری لوگو تم کیا جشن مناؤ گے

مانا بلند تر ہیں پہاڑوں کے سلسلے	لیکن زمیں میں وہ بھی تو آخر اُتر گئے

عشق زندگی کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اور یہ کہہ دینا کہ شاعری میں عشق عاشقی کے سوا ہوتا ہی کیا ہے بے وقوفی کی دلیل ہے۔ آج بھی پوری کائنات اسی عشق کے محور پر گردش کر رہی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ یہی وہ تنہا جذبہ ہے جس پر ابھی تک سائنس کی گرفت نہیں اور یہ جذبہ سائنسی ایجادات سے ابھی تک سرد نہیں ہو سکا ہے۔ اسی جذبہ عشق سے تمام دوسرے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اسی جذبے کی شدت آدمی کو اظہار و بیان کے نئے نئے اسلوب بھی دیتی ہے۔ خمار فاروقی بھی اس جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں ہر چند ان کا کھوج لگانا مشکل ہے آج ان کی توجہ بھی تکلیف کا باعث ہے — کل جن کا تغافل بھی تسکین کا سامان تھا

اُس دور میں ہم دونوں اخلاص کا پیکر تھے	جب تم بھی پریشاں تھے اور میں بھی پریشاں تھا

ہر چند ہم نے عشق میں خود کو مٹا دیا	جینے کا اہلِ دل کو قرینہ سکھا دیا

ہر قدم پر سنبھلنا ہے مشکل مجھے	کیا یہ دُنیا تری رہگذر ہو گئی

سائے کی طرح تیرے تعاقب میں ہوں مگر	رستے کے پیچ و خم سے ہوں نا آشنا ابھی

دُنیا تو خیر غیر ہے دُنیا کا کیا گلہ	لیکن وہ ایک شخص جو بیگانہ ہو گیا

یہ اشعار تمام غزلوں سے منتخب نہیں کئے گئے ہیں۔ مشتے از خروارے کے طور پر پیش ہیں۔ ان اشعار کو پڑھ کر آپ یہ ضرور محسوس کریں گے کہ ہر شعر کی گرفت میں ایک تجربہ ہے جو جذبے کی سچائی اور احساس کی شدّت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور اس جذبے کا اظہار کہیں آپ بیتی کے انداز میں ہے اور کہیں جگ بیتی کے انداز میں۔ ان تجربات میں ہجر و وصال کی کیفیات اور احساسات کا اظہار بھی ہے اور زندگی کے رد و قبول کی نشاندہی بھی۔ ان تجربات میں آپ کو انسان کا اپنے اللہ سے رشتہ، انسان کا کائنات سے رشتہ اور انسان کا انسان سے رشتہ نہایت مضبوط سے مضبوط تر نظر آئے گا۔ اور یہ سارے رشتے ایک اکائی کی صورت میں جب شعر کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں تو وہ غم ذات اور غم کائنات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں خمار فاروقی انہی غموں سے اپنے شاعری کے کینوس کو وسعت دیتے ہیں اور یہی وسعت ان کے ذہنی بلوغ اور GENIUS کا مظہر ہے۔ دُعا ہے کہ وہ شعری ذہن کے ارتقائی منازل اسی تیزی سے طے کریں جس تیزی سے انہوں نے اب تک طے کئے ہیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

جوان شاعری

کہتے ہیں کہ شاعری بڑھاپے میں جوان ہوتی ہے۔

یہ کہہ کر میں نے دراصل راسخ عرفانی کو بوڑھا اور ان کی شاعری کو جوان کہا ہے۔
ان کی شاعری یقیناً جوان ہے اور وہ یقیناً بوڑھے۔

جوانی میں احساس کی نزاکت اور جذبہ کی شدّت زیادہ ہوتی ہے، ایک طرف احساسِ حسن کی فراوانی سے آدمی اپنے جذبات کے حسین خط وخال کو تراشتا ہے اور جذبات کو ایسی ایسی شکلیں دیتا ہے کہ آئینۂ خیال خود ایک حسین مرقع بن جاتا ہے دوسری طرف وہ احساسات کو صوت دنوا سے آشنا کرتا ہے اور ان سے ایسے ایسے نغمے ظہور پذیر ہوتے ہیں جو روح کو بالیدگی بخش کر زندگی کو ہزار طرح کی توانائیوں سے آشنا کرتے ہیں اور یوں بہت سے دُکھوں سے آدمی کو نجات مل جاتی ہے اور پھر وہ زندگی کی جدّوجہد میں زیادہ توانا، زیادہ جری اور زیادہ پامرد ہو کر آگے بڑھتا ہے۔

بڑھاپے میں آدمی کے ظاھری قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں لیکن باطنی قویٰ زیادہ فعال اور مستحکم ہوتے، اس استحکام میں تجربوں کی توانائی اور مشاہدوں کی بڑائی کا دخل ہوتا ہے۔ بصیرت اقدار کے احترامات سے منوّر ہوتی ہے اور زندگی کی جلوہ سامانیوں میں اضافہ کرتی ہے، عقل کی پختگی جذبات کو خوب وزشت کے خانوں میں تقسیم کرتی رہتی ہے اور اس طرح تہذیبِ نفس کے ہزارہا پہلو پیدا ہوتے ہیں جو انسانی خواہشات کے چھپے ہوئے گوشوں کو بھی سامنے لاتے ہیں اور اس طرح ذکاوت اور فطانت میں اضافہ کر کے آدمی کو زیادہ معتبر اور زیادہ بصیر بناتے ہیں اور جب یہ سارے عناصر یعنی احساسات، جذبات، مشاہدات، بصیرت اور عقل ودانائی

ایک اکائی کی صورت اختیار کر لیں تو پھر زندگی حسن اور حسنِ نظر کے سوا اور کچھ نہیں رہتی۔

میں نے راسخ عرفانی کو بوڑھا اور ان کی شاعری کو جوان کہا ہے اور انہی دو[۲] عناصر نے ان کی شاعری کا سارا تار و پود بنا ہے یعنی بڑھاپے اور جوانی سے!!

بڑھاپے نے اُن کی شاعری کو تہذیبی اقدار کی شناخت، محبت کے رشتوں کی استواری، قومی روایات کی پاسداری، حُسن و عشق کے تعلقات کی پاکیزگی جذبات کے اظہار میں سنجیدگی زندگی کی جدّوجہد میں پامردی، خوب و زشت کی پہچان، اپنی مٹی سے پیار، تحقیق و جستجو کی افادیت، اظہار و بیان میں بے باکی انسانی نفسیات کی نباضی، معاملات میں اعتدال پسندی، غرض ان تمام خوبیوں سے مزین کر دیا ہے جو بڑی شاعری کے لئے ضروری بھی ہیں اور اس کی پہچان بھی ہیں۔ اصل میں وہی شاعر بڑا ہے جس کا تہذیبی ورثہ بڑا ہے اور تہذیبی ورثہ حاصل کرنے کے لئے عقل کی بلندگی ہی کام نہیں آتی بلکہ سن و سال کا پھیلاؤ بھی ضروری ہوتا ہے اس دعوے کی دلیل میں راسخ عرفانی کے کچھ شعر پڑھیں ؎

موجِ طغیانی کہاں ساحل کا خمیازہ کہاں!
دل ہے دریا اس کی گہرائی کا اندازہ کہاں

پیشِ نظر تھے پھول بھی، پتھر بھی، لعل بھی
جو جس کے تھا نصیب میں اس نے اُٹھا لیا!

مرنا تو رہِ عشق میں آسان ہے لیکن
جینا ہو تو جینے کے بھی اسباب بڑے ہیں

عجب منظر دکھائے مد و جزرِ بے یقینی نے
مری اُمید کی کشتی کہیں ڈوبی کہیں نکلی

رنگوں سے بے نیاز ہے موسم کا زیر و بم !
اُڑتے ہیں سبز پتّے بھی بادِ خزاں کے ساتھ

استقامت کی حدیں لاکھ ہوں مضبوط مگر
زلزلہ آئے تو کہسار بھی ہل جاتے ہیں

سچّائی کے طالب تھے ہم ایسے پُرفن لوگوں سے،
جن کے لب پر گھڑے گھڑائے لاکھ بہانے حیلے تھے

میں محافظ ہوں روایاتِ کہن کا اب بھی
دَورِ نَو شوق سے سُولی پہ چڑھا دے مجھ کو

وقت کی دھوپ نے پتھر بھی جھلس ڈالے ہیں
باغ تو باغ ہے صحرا نہیں دیکھا جاتا

ابھی تک پستیوں میں جا رہا ہوں
نہ جانے کس ستارے سے گرا ہوں

یہ دربارِ شہی کیا ہے مجھے راسخ سلیقے سے
خدا کے سامنے بھی ہاتھ پھیلانا نہیں آتا

آپ نے دیکھا ان اشعار میں تجربے اور مشاہدے کے علاوہ انسانی نفسیات کا گہرا شعور اور مطالعہ بھی ملتا ہے۔ زندگی کے نامساعد حالات کی آگاہی بھی پائی جاتی ہے،

عزم و حوصلہ کی خارا شگافی بھی نظر آتی ہے، عمل اور ردِ عمل کے گہرے اثرات بھی ہیں اور اپنی روایات کی پاسداری کا ولولہ بھی۔

ان اشعار کو میں راسخ عرفانی کے بوڑھاپے کی دَین اور عطا سمجھتا ہوں۔ اگر وہ بوڑھے نہ ہوتے تو زندگی پر اتنی عمیق نگاہ ڈالنے کا حوصلہ کہاں سے لاتے اور احساسات اور جذبات کی تنقیح کا یہ سلیقہ کیسے میسّر آتا اور خوب و زشت کی یہ تمیز کس طرح نصیب ہوتی۔

اب آیئے راسخ کی جوان شاعری کی طرف، جوانی دیوانی ویسے ہی مشہور ہے۔ اس لئے آپ کسی ایک طرزِ عمل کا اس کو پابند نہیں بنا سکتے، لغزشیں بھی ہوں گی، گناہ بھی سرزد ہوں گے۔ توبہ کے لئے قفلِ زبان بھی کھُلے گا۔ دعا کے لئے ہاتھ بھی اُٹھیں گے۔ حُسن و محبت کی داستانیں بھی مرتب ہوں گی، شرم و ناموس کی قبا بھی پارہ پارہ ہوگی۔ سرمستیوں میں رات دن بسر بھی ہوں گے، عیش و عشرت کے لمحات کی گرفت بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوگی۔ حوصلوں اور ولولوں کی بلندیاں آسمان کے تارے توڑنے کی کوشش کریں گی۔ حکایات نو بہ نو کی بھی تصنیف ہوگی، غرض کیا کچھ نہیں ہوگا۔ راسخ عرفانی کی جوان شاعری میں یہ سب کچھ ملے گا۔

موجبِ فکر سہی شامِ جدائی لیکن
نیند سے کیوں ہے مرا دیدۂ بیدار خفا

ریشمی سی جالیوں میں جھلملاتی چاندنی
تیرے آنچل نے سمیٹے کتنے مہتابوں کے رنگ

نیم وا پلکوں میں مستانہ بہاروں کا ہجوم
جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھے گئے خوابوں کے رنگ

اس زلف کی خوشبو ہے کہ گلزار میں راسخ
دامانِ بہاراں سے کہیں پھول جھڑے ہیں

میں اپنا درد آپ تک محدود رکھتا ہوں
تڑپنا جانتا ہوں مجھ کو تڑپانا نہیں آتا

زندانِ انتظار کا در ٹوٹتا نہیں!
اک دوست عمر بھر کی سزا دے گیا مجھے

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد کون کم بخت ہے جو راسخ عرفانی کی جوان شاعری پر ایمان نہیں لائے گا۔ اس جوان شاعری میں جدید غزل کی تمام تکنیکی خوبیاں موجود ہیں، جذبہ کی بھرپور گرفت، تجربہ اور مشاہدہ کا واضح ابلاغ، مضامینِ تازہ کی تلاش، حُسن کا پاکیزہ احساس، جوانی کے محسوسات میں تجدیدی شان، الفاظ کی نغمگی کا پورا کیف واثر، الغرض راسخ عرفانی بڑھاپے میں نہایت جواں ہیں۔
لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ شاعری بڑھاپے میں جوان ہوتی ہے۔

سچّی شاعری

شاعری میں ہجو اور مدح دونوں پیرایۂ اظہار نہایت مشکل ہیں، مادح کے لئے لازمی ہے کہ وہ وہی صفات بیان کرے جو فی نفسہٖ ممدوح میں موجود ہوں اور ان کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر نہ ہوتا ہو اور اگر ایسا نہ کیا تو مدح پر مدح بالذم کا اطلاق ہوگا اور یہی ہاجی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہجو میں وہی بیان کرے جس کا اطلاق کسی اور پر نہ ہو۔ درباری شاعروں نے بادشاہوں کے ایسے قصیدے کہے ہیں جو مبالغہ کی نہایتِ اعلیٰ مثال ہونے کے علاوہ مدح بالذم کی بھی نہایت عمدہ مثال ہیں مثلاً بہادر شاہ ظفر کے متعلق ذوقؔ اور غالبؔ کے قصیدے نمونے کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں، ذوقؔ کہتے ہیں ؎

بعدِ شاہانِ سلف رکھتا ہے تُو یُوں تفضیل
جیسے قرآں پسِ توریت و زبور و انجیل
تُو ہے اس طرح سے عزت دہؔ اولاد تمور
جیسے موسیٰؑ شرف افزائے بنی اسرائیل

وغیرہ وغیرہ۔

غالب کہتے ہیں ؎

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ ⁂ مظہر ذوالجلال والاکرام

شہسوارِ طریقہ انصاف ⁂ نو بہارِ حدیقۂ اسلام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم ⁂ رزم میں اوستادِ رستم و سام

وارث ملک جانتے ہیں تجھے ⁂ ایرج و تور و خسرو و بہرام

دیکھئے یہ قصیدے ایسے بادشاہ کی شان میں ہیں جو سیاسی اور جسمانی دونوں اعتبار سے نہایت کمزور اور جس کا گذارہ انگریزوں کے وظیفہ پر تھا اور جس کا حکم صرف قلعہ تک محدود تھا۔

حجاج بن یوسف نہایت جابر حکمراں تھا لوگ اس کے ظلم سے پناہ مانگتے تھے، ایک عرب شاعرہ اُمّ کلثوم نے اس کا قصیدہ کہا اور اس کو دربار میں سنا کر حجاج بن یوسف سے انعام واکرام بھی پایا لیکن اس قصیدہ میں اُس نے یہ صنعت رکھی تھی کہ اس کا ہر شعر تعریف بھی تھا اور ہجو بھی، اُمّ کلثوم کے قادر الکلام ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کمال عربی زبان کی وسعت کا بھی ہے۔

اردو شاعری میں یہ کمال حاصل نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا شعراء کو بڑی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے اور پھر جب رسول اکرمؐ اور اہل بیت رسولؐ کا ذکر یا مدح مقصود ہو تو اور بھی زیادہ احتیاط لازمی ہے۔

اردو شاعری میں نعت و منقبت کا سرمایہ خاصا وافر ہے مگر اس سرمایہ میں ایک بڑا حصہ افراط و تفریط سے پُر ہے اور شعراء نے نہ صرف افراط و تفریط سے کام لیا ہے بلکہ ان نفوسِ قدسی سے ایسی باتیں منسوب کی ہیں جو نعوذ باللہ شرک کے دائرہ میں آتی ہیں۔

نعت ہو منقبت ہو یا مرثیہ شعراء کو ان اصناف میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے، حالی سے قبل اردو نعت گوئی میں عام طور پر شمائل رسولؐ کی خوبیوں کے بیان پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

اور اسوۂ حسنہ یا تعلیماتِ رسول پر زیادہ توجہ نہیں تھی۔ حالی کے بعد اب نعتِ رسول کا موضوع زیادہ تر حضورؐ کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب نعت گوئی میں تاثیر اور تاثر کی فضا زیادہ نمایاں ہے اور شعراء نے اس صنف کو نہایت فخر و مباہات کے ساتھ قبول کیا ہے اور شاید ہی اردو کا کوئی شاعر ایسا ہو جس نے نعت یا اہل بیت اطہار کی مدح میں شعر نہ کہے ہوں بلکہ ان دس بیس برسوں میں نعت و منقبت کے لاتعداد مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں اور بعض شعراء کی پہچان ہی نعت و منقبت ہے اور ان کو دوسری اصناف سے سروکار نہیں۔

فارسی شعراء نے یقیناً اسوۂ رسول کو بھی شمائل رسولؐ کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور آپؐ کے کمالات کی ستائش کی ہے۔ سعدی کا یہ قطعہ تو قبولِ عام کی سند کے لئے نہایت مشہور ہے ؎

بَلَغَ العُلےٰ بِکَمَالِہٖ

کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ

حَسُنَت جَمِیعُ خِصَالِہٖ

صَلّوا عَلَیہِ وَآلِہٖ

اور اسی طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا یہ قطعہ بھی زبان زدِ عام ہے ؎

یا صاحب الجمال و یا سید البشر

من وجہک المنیر لقد نور القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

معلوم ہوا کہ شعری تخلیقات میں صرف موضوع ہی اہم نہیں ہوتا بلکہ موضوع کا برتنا بھی اہمیت رکھتا ہے، اور اسی کو شاعر کا اسلوب کہتے ہیں۔ یہ اسلوب شاعر کی ذاتی، قوتِ فکر، تخلیقی ندرت اور

فنی مہارت سے حاصل ہوتا ہے اور اسلوب ہی کسی تخلیق کو ادنیٰ و اعلیٰ، عارضی اور دائمی یا صحافیانہ اور ادبی مقام پر فائز کرتا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ موضوعات غیر اہم ہیں، یہ ضرور ہے کہ بعض موضوع اہم بعض غیر اہم اور بعض اہم تر ہوتے ہیں لیکن شاعری میں ان کا انحصار فنی دلکشی اور اسلوب اظہار ہی پر ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعری میں بعض اہم موضوع غیر اہم اور بعض غیر اہم موضوع اہم بن جاتے ہیں اور یہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ شاعر کی خوش مذاقی، فنی صلاحیت، احساسِ جمال، روایت کا پاس، اور مشاہدے اور تجربہ کا تنوع اور فکر و خیال کی ندرت کم اہم موضوع کو اہم بنا دیتی ہے، مثال کے طور پر لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد یا ایسی ہی بہت سی داستانوں اور واقعات کو شاعروں نے اپنی فنی صلاحیت سے ابدی بنا دیا حالانکہ ایسے واقعات نہ جانے کتنے روز ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

حضورؐ کی ذات اور تعلیمات اور ان نفوس قدسی کی زندگیاں جنہوں نے حق و باطل کے معرکے میں نہایت پاکیزہ کردار ادا کیا اور رسول اکرمؐ سے کسی نہ کسی پہلو سے وابستہ رہیں، موضوع اور واقعات کے لحاظ سے نہایت اہم بھی ہیں اور ضروری بھی۔ اسی لئے شعراء نے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس موضوع کو نہایت خوش اسلوبی، فنی مہارت، ندرت خیال اور پاکیزگی کے ساتھ اپنی شاعری میں برتا ہے اور شاعری کے نہایت اعلیٰ نمونے حاصل کئے ہیں۔

آیئے اب ان خیالات کی روشنی میں نعیم میرٹھی کے نعتیہ اور منقبتی کلام کا جائزہ لیں۔

نعیم میرٹھی رسول مقبولؐ سے اپنی محبت کی سرشاری کا اظہار بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں لیکن یہ والہانہ انداز ادب کے دائرہ سے تجاوز نہیں کرتا اور تمام و کمال احترامات کے ساتھ رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کے دائرہ میں رہ کر ہی نعت کے حسین اور خوبصورت شعر تخلیق کرتا ہے۔ نعیم میرٹھی کا بیان نہایت سادہ ہے اور انداز بیاں کی اسی سادگی نے تاثیر اور تاثر کی بھرپور فضا پیدا کی ہے جو ذہن و دل کو دیر تک سرشار رکھتی ہے، ان کی تشبیہیں اور استعارے بعید از قیاس نہیں ہیں اور آدمی کی فہم و ذکاوت کا امتحان نہیں لیتے۔ وہ رسول مقبولؐ کی

صفات کو یا رسول مقبولؐ کی ذات سے اپنی محبت کی وابستگی کو نہایت سہل انداز میں بیان کرتے ہیں، ویسے بھی محبت کی زبان سادہ ہی ہوتی ہے اور صرف محبت کرنے والے دل ہی اس کے مفاہیم سے واقف ہوتے ہیں۔

دعائیں زندگی کی دینے والے یہ دعا بھی دے ؛ شعورِ ذاتِ پیمبرؐ بھی مل جائے مقدر سے
نعیمِ خستہ جاں جس نے کھلائے پھول صحرا میں ؛ وہی ابرکرم اکر کبھی گھر پر مرے برسے

بھٹک سکتے نہیں وہ اک قدم بھی منزلِ حق سے ؛ جو رہرو اس سفر میں راہِ پیغمبرؐ سے چلتے ہیں

عمل نبیؐ کا ہمیشہ تری نظر میں رہے ؛ کہ امتیاز تو کچھ تجھ کو خیر و شر میں رہے

جو چاہتا ہے کہ منزل پہ سرخرو پہنچے ؛ تو نقشِ پائے محمدؐ تری نظر میں رہے
بس ایک بار محمدؐ کہا تھا اس کے بعد ؛ تمام عمر اجالے ہمارے گھر میں رہے

ہر نفس ذکرِ خیر البشرؐ چاہیئے ؛ لمحہ لمحہ مجھے معتبر چاہیئے
راہِ طیبہ میں یادِ نبیؐ ساتھ ہو ؛ اس سفر کے لئے ہمسفر چاہیئے
خلد نظارہ ہے جلوہ گاہِ نبیؐ ؛ ہر قدم احتیاطِ نظر چاہیئے

نبیؐ کا نام جب میں نے لیا ہے ؛ اجالوں سے مرا گھر بھر گیا ہے

ان اشعار میں احتراماتِ رسولؐ کے ساتھ ساتھ اپنی محبت کا اظہار نہایت والہانہ انداز میں کیا گیا ہے، ہر نفس میں ذکرِ خیر البشرؐ کی تمنا ہی زندگی کو اعتبار بخشتی ہے اور یہی اعتبار

نعیم میرٹھی کا مقصود و منشاء ہے اور زندگی کی مسافت میں یادِ نبیؐ کی ہمسفری بھی منزلِ حق کی رسائی کی ضمانت ہے اور اس سفر میں احتیاطِ نظر بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ طیبہ کا چپہ چپہ انوار رسولِ مقبولؐ سے جنت نگاہ ہے۔ یہاں جنیدؒ و بایزیدؒ بھی گم کردہ نفس آتے ہیں۔ یہ اشعار خانہ پُری کے لئے نہیں کہے گئے ہیں بلکہ رسولؐ کی محبت کے حوالے سے زندگی گذارنے کا ایک واضح تصور دیتے ہیں نہ صرف نعیم میرٹھی کو قاری اور سامع کو بھی۔

رسولِ اکرمؐ سے محبت ہی نے ان نفوسِ قدسی سے بھی محبت کے رشتے استوار کرائے ہیں جو نبیؐ کی ذات سے وابستگی کی بناء پر خود بھی مقدس و محترم ہیں اور اپنے اتقاء اور دینِ حق کی سربلندی کے لئے اپنی قربانیوں سے ہماری عقیدت و احترام کا محور و مرکز ہیں۔ نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقاء نے دینِ حق کی سربلندی کے لئے اپنی جانوں کے جو نذرانے پیش کئے وہ یقیناً تاریخِ اسلام کا روشن باب ہیں اور ہماری رہبری اور رہنمائی کے لئے منارۂ نور ہیں ان کی مدح و ستائش اور ان کے کارناموں کو بار بار دھرانا ہمارا دینی فریضہ ہونا چاہیے نعیم میرٹھی نے ان نفوسِ قدسی کو جو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے وہ بھی ان کی شاعری کا درخشاں پہلو ہے ؎

جو سر پہ ہمیشہ رہی خاتونِ جناں کے ؛ تطہیر کی آیۃ اسی چادر کیلئے ہے

باپ ختم المرسلینؐ، شوہر ولیؓ، بیٹے امام ؛ اہلِ دنیا دیدنی ہے اقتدارِ فاطمہؓ

ہے تربیت کا نمونہ حسینؓ جیسا پسر ؛ ادائے حق میں بہت کامیاب ہیں زہراؓ

اصولِ سرفروشی مسلکِ آلِ ابوطالب ؛ کوئی دنیا میں ان جیسا وفا پرور نہیں ملتا

رواں ہو جس کی رگوں میں ولائے آلِ رسولؐ ؛ بڑھائے ہاتھ وہی ہم سے دوستی کے لئے

ہو جس کی گھٹی میں سرکار کا لعابِ دہن ؛ اسی کو زیب ہے کہلائے ترجمانِ رسولؐ

جس کو خوشنودی نبیؐ کی اور علیؑ کی ہو عزیز ؛ وہ مدینہ اور نجف سے پہلے آجائے کربلا

اِن اشعار میں صرف اور صرف وہی اوصاف بیان کئے گئے ہیں جو فی نفسہٖ ممدوحین میں موجود ہیں، کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا گیا ہے، پھر شاعری کے تمام تقاضے بھی ملحوظ رکھے ہیں، تاثیر اور سرشاری کی فضا بھی قائم ہے۔ غرض ہر لحاظ سے یہ اندازِ مدح سرائی قابلِ ستائش ہے اور یہی سچی شاعری ہے نعیم میرٹھی قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنی نعتیہ اور منقبتی شاعری کو دوسروں کے لئے قابلِ تقلید بنادیا ہے، اللھم زد فزد!!

حضرت شہباز امروہوی

طنز و مزاح کی شاعری کا باقاعدہ آغاز عہدِ عالمگیر کے شاعر جعفر زٹلی سے ہوتا ہے، اگر جعفر زٹلی کے فواحشات سے قطع نظر کرلی جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اس کے کلام سے اُس زمانے کے سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی حالات کا بہت کچھ سُراغ ملتا ہے، وہ اپنے زمانے کی تہذیبی اور تمدّنی زبوں حالی پر بے لاگ تنقید کرتا ہے۔ یُوں تو مزاح کے نمونے امیر خسرو کے یہاں بھی ملتے ہیں مگر انھیں شعراء کے اُس زُمرہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا مثلاً خسرو کا یہ قطعہ ؎

ہندو بچہ دیدم کہ عجب حُسن دھرے چھے
بروقتِ سُخن گفتن پھول جھرے چھے
گفتم زلب لعلِ تُو یک بُوسہ بگیدم
گفتا کہ ارے رام تُرک کائیں کرے چھے

ترجمہ:۔ میں نے ایک ہندو بچّہ کو دیکھا کہ غضب کا حُسن رکھتا ہے
گفتگو کے وقت اُس کے مُنھ سے پھُول جھڑتے ہیں
میں نے کہا میں تیرے گلابی ہونٹوں کا ایک بُوسہ لے لُوں
بولا "ارے رام تم مسلماں (ترک) ہوکر کیا کرتے ہو

جعفر زٹلی کے بعد صرف سودا اور انشاء کا نام ہے سودا اُردو غزل اور قصیدہ کے نہایت مقتدر شاعر ہیں لیکن ہجویہ قصیدوں میں ذاتی ہجو کا اثر زیادہ ہے اور یہی حال انشاء کا ہے، پھر بھی سودا کے ہجویہ قصیدوں، تضحیکِ روزگار، قصیدۂ شہر آشوب وغیرہ میں طنز و مزاح کی چاشنی بھرپُور انداز میں ملتی ہے اور اس طرح اُس دَور کی سیاسی اور معاشرتی زبوں حالی کا پُورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

سودا اور انشاء کے بعد طنز و مزاح کی شاعری میں کوئی قابلِ ذکر نام نہیں ملتا، البتّہ اُنیسویں صدی میں اکبر الہ آبادی نے اس صنف میں وہ کمال پیدا کیا کہ آجتک کوئی ان کا حریف پیدا نہ ہوسکا۔ اکبر کی طبیعت کو طنز و مزاح سے خاص لگاؤ تھا ہی مگر ان کو ماحول بھی نہایت سازگار ملا، ان کا زمانہ سیاسی تبدیلیوں اور جدید اور قدیم کی آویزش کا زمانہ تھا اور مشرق اور مغرب کے تہذیبی تصادم نے ان کو شاعری کے

نئے نئے محرکات فراہم کئے اور انکی شاعری کے موضوعات میں، معاشی عدم توازن، مذہبی زوال آمادگی، ریاکاری، تہذیبی بے راہروی، حکومت اور حکومت کے اعضاء کی ناہمواری غرض سماج اور اس کے وہ تمام شعبے شامل ہوتے جن کا تعلق، عام آدمی سے تھا۔ پھر انھوں نے اپنے اسلوب اظہار کو بھی عوامی رکھا اور اس اسلوب کو ہمہ گیر اسلوب کے طور پر استعمال کیا۔

اکبر کی شاعری سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ طنز و مزاح کو ایک صنف کے طور پر قبول عام حاصل ہوا اور اس طرح اکبر کے بعد بھی بہت سے طنز و مزاح کے شاعر نمایاں ہوئے جن کی فہرست خاصی طویل ہے ان میں ظریف لکھنوی، احمق پھپھوندوی، بُوم میرٹھی، شوق بہرائچی، فرقت کاکوروی، ظریف دہلوی، راجہ مہدی علی خاں، محمود سرحدی سے لے کر دلاور فگار، ضمیر جعفری، شیخ نذیر، مجید لاہوری، ظریف جبلپوری، انعام درّانی، عنایت علی، سیّد محمد جعفری اور شہباز امروہوی تک بے شمار نام ہیں۔ ان میں ہر شاعر نے اپنے اسلوب میں مختلف موضوعات کو اپنایا لیکن اکبر کی قد اور شخصیت تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ بلکہ اکبر کا رنگِ سخن ہی ان سب کے کلام پر حاوی رہا۔ اور یہاں تک ہوا کہ اقبال نے بھی اکبر کے رنگِ سخن کو اپنانے کی کوشش کی۔ موجودہ دور میں بھی محرکات شعری وہی رہے جو اکبر کے زمانے میں تھے مثلاً وہی سیاسی ناہمواری، وہی جدید اور قدیم اقدار کی آویزش، وہی معاشی بدحالی، اور وہی تہذیبی زوال آمادگی وغیرہ وغیرہ اسی لئے اس دور کے شعراء نے بھی طنز و مزاح کا ہدف انہی موضوعات کو بنایا۔

ان شعراء میں ایک معتبر نام حضرت شہباز امروہوی کا ہے ان کا اصل نام سلطان احمد صدیقی ہے وہ امروہہ میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے مسلم تخلص تھا اور سنجیدہ شاعری کرتے تھے ۱۹۵۵ء میں شہباز تخلص اختیار کیا اور طنز و مزاح کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ۱۹۴۵ء میں بصارت سے محرومی نے انھیں مایوسی کے اندھیروں میں نہیں دھکیلا بلکہ انھوں نے نئے حوصلہ سے اس محرومی کا مقابلہ کیا اور اسی حوصلے نے ان میں وہ حسِ انبساط پیدا کی جو دوسروں کے لئے بھی تفریح و مسرت کا سبب بنی۔ ان کی شاعری کے موضوعات بھی وہی رہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے وہ اپنی شاعری میں کہیں پائے ثقاہت سے نہیں گرتے اور طنز و مزاح کو پھکڑ پن اور فحاشی سے پاک رکھتے ہیں ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت زبان و بیان کی سلاست اور صفائی ہے چونکہ وہ تدریس کے پیشے سے منسلک رہے ہیں اس لئے انسانی نفسیات سے بھی بخوبی واقف ہیں اور ان کی شاعری میں اس کے اظہار کے بھی اعلےٰ

نمونے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں استعارات اور تشبیہات کا نہایت خوبصورت استعمال ملتا ہے موضوعات کے تنوع نے ان کی شاعری کو رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ بنا دیا ہے جو ہر شخص کے لئے کشش کا باعث ہے۔ آئیے ان کے کچھ قطعات پڑھیں ۔

غنچوں کا ہیں تبسم، موجوں کا ہیں ترنم
طوطی کا زمزمہ ہوں، بلبل کا چہچہہ ہوں
احباب مجھ سے خنداں، احباب مجھ سے شاداں
شہباز میں بھی گویا دیوار قہقہہ ہوں

جبہ در بر ہوں نہ دستارِ فضیلت بر سر
دور کی بھی تو نہیں علم سے نسبت مجھ کو
پھر بھی کہتے ہیں جو شہباز مجھے علامہ
کیا سمجھتے ہیں کوئی فاحشہ عورت مجھ کو

تسخیر جس سے کر لے وہ پبلک کے قلب کو
اعجاز ایسا کب کوئی اس کے بیاں میں ہے
دشمن کی بے بسی کا یہ منظر تو دیکھئے
اردو سے اختلاف بھی اردو زبان میں ہے

دیکھی مری درخواست تو اے حضرتِ شہباز
ماتھے پہ شکن ڈال کے بولے یہ مکرجی
میں گور کروں گا کبھی ہرگز بھی نہ اس پہ
اردو میں تو کیوں لایا ہے لکھوا کے یہ ارجی

کرتے ہیں آج میری وفاداریوں پہ شک
کل ہر طرف تھا جن کی دغابازیوں کا شور
کہتے ہیں اس ادا سے وہ مجھ کو نمک حرام
جیسے بڑے کہیں کے وہی ہیں حلال خور

بدلا لینا ہے اگر حضرتِ آدم کا تمہیں
جنسِ گندم سے کبھی عشق ہویدا نہ کرو
گیہوں کی کاشت کا کیا ذکر ہے اے آدمیو!
گندمی رنگ کی اولاد بھی پیدا نہ کرو

آپ نے دیکھا ان قطعات میں سیاسی، تہذیبی، اقتصادی غرض تمام زندگی کے شعبوں پر بھرپور تنقید کی گئی اور اس لطافت کے ساتھ کہ طبیعت پر گراں نہیں گزرتی بلکہ ایک ہلکا تبسم لبوں پر کھل جاتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کا مزاح اسی کو کہتے ہیں۔

حضرت شہباز کی شاعری میں زبان اور محاورہ کا صحیح استعمال اس خوبی سے ہوا ہے کہ انکے مزاح کی چاشنی میں مزید اضافہ ہوا ہے، زبان و بیان کی یہ صفائی ان کے قادر الکلام ہونے کی دلیل ہے پھر عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی پر بھی انھیں قدرت حاصل ہے اور وہ ان زبانوں کے الفاظ نہایت برمحل انداز میں نظم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جزئیات نگاری میں بھی ان کو کمال حاصل ہے، بصارت سے محرومی کے باوجود ان کی شاعری کا یہ پہلو نہایت حیرت انگیز ہے مثلاً۔۔ ان کی نظم "حکیم جی" کے یہ شعر ۔

تھی تخت پر بچھی ہوئی اُجلی سی چاندنی　　　مسند تھی اُس پہ ایک طلاکار جگمگی
مسند کے آگے چوکی تھی چھوٹی سی صندلی　　　رکھّا تھا اُس پہ ایک قلمداں کچھ ردّی

حُقّہ دھرا تھا سامنے خوش رنگ و مُشک بُو
پہلو میں پیکدان تھا کرنے کو اَخ تھو

تختوں پہ تھی سجی ہوئی ہر چیز بر محل　　　تھیں درمیاں میں بوتلیں، ڈبے اغل بغل
رکھا تھا زیرِ تخت قرعہ انبیق اور کھرل　　　پوشیدہ ایک گوشہ میں تھا آلۂ عمل
ترتیب سے مطب کے سلیقہ برستا تھا
تھی مُوسلی کھرل میں تو ہاون میں دستہ تھا

ان کی ایک مشہور نظم "انٹرویو" میں سوالات اور ان کے جوابات بھی خاصے کی چیز ہیں ؎

بند کا قومی پرندہ کیا ہے؟ جی، وہ گائے ہے　　　کون ہیں جو این لائی؟ چین کی اِک چائے ہے
کون تھا سنگر کا موجد؟ آگرہ کا تان سین　　　بُدھ کا اصلی نام کیا تھا؟ لالہ منگل داس جین!
مارکو پولو کی بابت تم کو کیا معلوم ہے؟　　　کھیل پولو کا اسی کے نام سے موسوم ہے
ہے رواں دُنیا کے کس خطے میں دریائے مرے　　　ملک پاکستان میں کوہ مری سے کچھ پرے
لارڈ منٹو کون تھا؟ اردو کا افسانہ نگار　　　بیگر و کا ارتھ کیا ہے؟ نیاگرا کا آبشار
گو کھلے کو کس لئے حاصل ہے دُنیا میں وقار؟　　　اُو کھلے میں بند جمنا ہے انہی کا شاہکار

غرض حضرت شہباز امروہوی طنز و مزاح کے وہ مقتدر شاعر ہیں جن کی شاعری مُہذب مزاح اور دلکش طنز کا شاہکار ہے ان کی شاعری میں کہیں زبان و بیان، فصاحت و بلاغت، تشبیہات و استعارات یا عروض اور صنائع و بدائع میں کوئی جھول نہیں نظر آئے گا، بلکہ اُن کی شاعری میں ان کی نادرہ کاری کی مثالیں جا بجا آپ کو ملیں گی اور یہی وہ کمال ہے جو حضرت شہباز کو دوسرے طنز و مزاح کے شاعروں سے ممتاز کرتا ہے اور ادب میں وہ مقام ان کو دیتا ہے جو اکبر الہ آبادی کے بعد کسی اور کا حق نہیں!!

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید، ولے نہ از دلِ ما

(فیضیؔ)

نام : مسعود الحسن

تخلص : تابش دہلوی

مولد : دہلی

تاریخ پیدائش : ۹ر نومبر ۱۹۱۱ء

ددھیال : مولوی نظام الدین نظامی
(فارسی شاعر) کا خاندان

ننھیال : شمس العلماء منشی ذکاء اللہ کا گھرانہ

تعلیم : بی۔ اے۔

مطبوعات : نیم روز۔ تقدیس۔ چراغِ صحرا
غبارِ انجم۔ دید باز دید

ملازمت : آل انڈیا ریڈیو۔ ریڈیو پاکستان

موجودہ پتہ : بلاک نمبر ۳ اے ۹/۶ ناظم آباد کراچی
ٹیلیفون : ۶۶۱۶۸۲۵

تابش دہلوی کا فن نصف صدی سے بھی زیادہ عمر پر محیط ہے، وہ شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی، انھوں نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، نثر میں انھوں نے خاکہ نگاری کی ہے یادداشتیں بھی قلمبند کی ہیں تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کی پہچان شاعری ہے۔ وہ روایت سے اپنا شعور استوار رکھتے ہوئے عصری تقاضوں کو فراموش نہیں کرتے ان کی شاعری میں معنویت اور فکری عنصر زیادہ ہے، غالب کا تفکر، میر کی ملائمت اور نرمی اور فانی کی غم انگیزی کو جب تابش کی منفرد شخصیت سے ہم آہنگ کیا جائے تب تابش کی شاعری دل کے نہاں خانے میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تابش کی شاعری اور فکر کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ منفرد شاعر ہیں اور اس دور کی غزل کو حیاتِ دوام بخشنے والوں میں تابش کا نام سرِفہرست ہے وہی کافر غزل جوان کی پہلی محبت بھی ہے۔

ڈاکٹر شکیل نوازش رضا

بزرگ اور خوش گو سخن ور جناب تابش دہلوی گاہے گاہے نثر میں بھی اظہارِ خیال کرتے رہتے ہیں انھوں نے شعری تنقید بھی لکھی ہے اور شخصی خاکے بھی مرتب کیے ہیں دونوں میں فنی بصیرت، گہری ثقافت دید و دریافت اور انسان شناسی کے اثرات نمایاں ہیں۔ اُن کی نثر رواں دواں سبک اور فکر کی ایک مخصوص علمی اور ادبی نہج کی نشاندہی کرتی ہے سلیس اسلوب میں پُرکاری اور گہری معنویت کے امتزاج نے ان کی نثر کو بڑا دلکش اور پُروقار بنا دیا ہے۔

تابش صاحب نے بڑی یادگار علمی اور ادبی صحبتیں دیکھی ہیں۔ بڑے بڑے اساتذہ سے استفادہ کیا ہے اور ایسی ایسی محفلوں میں شریک ہوئے ہیں جن کے تذکرے ہماری ادبی اور ثقافتی تاریخ کا حصّہ بن گئیں ہیں۔ وہ شاعر، ادیب، عالم اور فن کار جن کی عظمت کے چراغوں سے آج کی علمی اور ادبی دنیا میں اجالا ہے جن کے نام ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ تابش صاحب کے اساتذہ، دوستوں اور شناساؤں میں شامل ہیں۔ اور اُن کے بارے میں تابش صاحب کے ذہن میں معلومات کا ایسا خزانہ محفوظ ہے جو منظرِ عام پر آجائے تو ادبی تاریخ کا ایک مستقل باب قرار پائے۔ فانی، جوش، یگانہ، سائل، بیخود، نظم طباطبائی، عظمت اللہ خان، وحید الدین تسلیم ڈاکٹر زور، امجد حیدر آبادی اور حکیم آزاد انصاری سے لے کر مخدوم، مجاز، فیض اور فراق گورکھپوری تک کے نام تابش صاحب کے مرقع یادداشت میں سجے نظر آتے ہیں اور جب تابش صاحب ان کا ذکر چھیڑتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم بذاتِ خود ان بزرگ فن کاروں کی محفل میں شریک ہیں اور ان کے اظہارِ خیال سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

تابش صاحب کو اپنے استاد حضرت فانی بدیوانی سے بڑی عقیدت ہے انھوں نے فانی کی یادوں کو پورے فن کارانہ سلیقے اور مخلصانہ دیانت کے ساتھ اپنے مضمون "یادِ ایامِ صحبتِ فانی" میں سمیٹ لیا ہے فانی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن یہ مختصر سا خاکہ فانی کی شخصیت، سیرت، اور شاعرانہ بزرگی کی تفہیم میں ہمیشہ معاون ثابت ہوگا۔ اس خاکے کے مطالعے کے بغیر فانی شناسی کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا۔ فانی کے بارے میں ان کے تین مضمون اور بھی ہیں جو اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ میراجی، سیّد ذوالفقار علی بخاری اور شاہد احمد کے خاکے بھی انھوں نے بڑی محبت سے لکھے ہیں اور اپنی ذاتی یادوں کو حسّاس قاری کے ذہن کا جز بنا دیا ہے "کچھ یادیں کچھ باتیں" اور "جب میں حیدر آباد میں تھا" ان کے دو ایسے یادگار مضمون ہیں جن سے عظمتِ رفتہ کا صحیح تاثر ذہن میں ابھرتا ہے۔ یہ ایک اثر آفریں تہذیب کی آخری بہار کا نقشِ لازوال ہیں۔ یہ سارے خاکے اور مضامین تابش صاحب کے نثری مجموعے "دید باز دید" میں یک جا کر دیے گئے ہیں۔

"دید باز دید" بزرگ فن کاروں اور قبلِ پاکستان کی ثقافت کا ایسا مرقع ہے جسے تابش صاحب نے بڑی چابکدستی فن کارانہ مہارت اور خوش ذوقی سے مرتب کیا ہے۔ اس مرقع کا ہر نقش دلکش اور جاذب نظر ہے۔ تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور تابش صاحب کی نثر ان کی شاعری کی طرح فکر انگیز اور معنی خیز ہے "دید باز دید" کو تابش صاحب کے کمالاتِ ادب کا اہم اور وقیع اظہار سمجھنا چاہیئے

ڈاکٹر اسلم فرخی